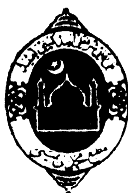
بکھرے ہوئے تارے

از

حق نواز خاں اختر



علی بھائی شرف علی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

نمبر ۳۴۳/۳۷ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

قیمت تین روپیہ آٹھ آنے

کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن

پرنٹر :- سلطان علی ایف - وادالا
مطبع محمدی گنپاوڈر روڈ مجگاؤں ممبئی
مالکان :- علی بھائی شرفعلی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

"انتساب"

اُن پُر خلوص دِلوں کے نام جو اَمنِ عالم، باہمی یگانگت اور ہندو مُسلم اتحاد کے متمنّی ہیں۔ اور جِن کا عقیدہ اِس قول پر مبنی ہے۔

"مذہب نہیں سِکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

رتن دہار۔ سیواجی پارک بمبئی
یکم جنوری ۱۹۴۵ء

حق نواز خاں اختر

فہرست عنوانات

پیشِ لفظ

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں !

آغاز

ایک بار مجھ سے کسی نے پوچھا :-
آپ افسانے پسند کرتے ہیں ؟
میں نے جواب دیا - میں بندۂ خدا ہوں۔ جب خدا اس حد تک افسانہ پسند ہے۔ کہ اُس کی آسمانی کتابوں میں بھی افسانے ہیں - تو اُسکے بندوں کو افسانے کیوں نہ پسند آئیں گے ۔

تاریخ جن فنونِ لطیفہ کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے ان میں سے ایک فن کہانی ہے۔ جو انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے ۔

اولین دَور رچرڈ ڈٹن نے اپنے مشہور ناول ماسٹر آف انگلش میں لکھا ہے کہ کہانی دنیا کی محبوب ترین شے ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی ابتدا اس وقت

ہوئی ہو جب انسانیت بچّے کی طرح گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔

دُوسرا دَور مارون کے قول کے مطابق دوسرے دَور میں انسان کے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں قلم آگیا۔ اور وہ پتھروں پر پتّوں پر چھوٹی چھوٹی تصویروں کی شکل میں خاموش کہانیاں لکھنے لگا۔

تیسرا دور جب اِن کہانیوں میں تسلسل پیدا ہوا۔ انسانوں کے گروہ میں رہبر پسندی کے جذبے نے راجے اور سردار پیدا کئے تو انسانیت کی توتلی زبان پر راجہ اور رانی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں آنے لگیں۔

چوتھا دَور چوتھے دور میں کہانی ایک فن گئی۔ درباروں میں داستان گو اپنی فن کاری دکھانے لگے۔ الف لیلیٰ۔ چہار درویش طلسم ہوشربا کے افسانے دلچسپیوں کا ایک نیا باب لیکر آئے۔

پانچواں دَور اور پانچویں دَور میں انسان نے زندگی کو زندگی کے بھیس میں دیکھا۔ انسانی غم۔ انسانی خوشیاں۔ انسانی مسائل۔ زندگی کا مدوجزر۔ اور نشیب وفراز۔ اخلاقیات اور جنسی معاملات۔ مذہب اور عقلیت۔ ایمان اور سائنس اِن سب پر انسانی نگاہیں تاریکی میں ٹارچ لائٹ کیطرح گھومنے لگیں۔ دیدۂ ودل کے مشاہدے الفاظ بن کر ساری دنیا میں بکھر گئے۔ پشکن۔ ٹالسٹائی۔ موپاساں۔ جیک لنڈن اناطول فرانس۔ رابندرناتھ ٹیگور۔ بنکم چندر۔ شرت چندر۔ پریم چند اسی روشنی کی کرنیں بنکر اپنے اپنے وطن کی محفل میں اُجالا کرنے لگے۔ نوجوانی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور ترقی پسند ادب کے نام سے سرزمین فسانہ نگاری میں نئے نئے پھول کھِلائے

کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ شفیق الرحمٰن۔ منٹو۔ عصمت چغتائی ترقی پسند ادب لیکر آگے بڑھے۔ اس مشعل میں نہ صرف انسانیت کا چہرہ نظر آیا۔ بلکہ اسکے دل و دماغ میں منقوش وہ دھبے بھی جنہیں دیکھکر اخلاق اور سماج چلا اُٹھے۔ مذہب نے گالیاں دیں لیکن وہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تنقید اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس کارواں کے پیچھے پیچھے وہ مسافر بھی ہیں جن کی جبین پر ابھی تک ٹالسٹائی اور ٹیگور کی ادبی شعاعوں کا نور ہے۔ انسانی سماج کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے چہروں میں اخلاقِ قدیمہ کی جھلک ہے۔ اِن ہی مسافروں میں ان کہانیوں کے ہیرو حق نواز اخترؔ ہیں۔ جن کی زبان دانی میں ادب قدیم کی لطافت اور چاشنی ہے۔ خیالات میں جدّت ہے۔ جدید ترقی پسند ادب کی ہمنوائی کرتے کرتے کبھی وہ کہانی کے بنیادی پلاٹ کو چھوڑکر تخیلات کا تانا بُن دیتے ہیں۔ اور کبھی قدیم رنگ کا سہارا لیتے ہوئے کہانی کے تمام کرداروں کو آگے بڑھتے ہوئے افسانوی عروج کی طرف لے جاتے ہیں۔ سیاسی تفکر اُن کے افسانوں کی روح ہے۔ سرمایہ پرستی کے پیہم مظالم کی تصویر میں اخترؔ نے رنگ آفرینی کی ہے۔ غریب اور مزدور اس کے افسانے میں آہیں بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے افسانہ میں اس دنیا سے ماوری ماحول پیدا کرتا ہے جہاں رومانیت ہے۔ شعریت ہے۔ اور کہیں کہیں یہ سب خواب مدہوش ساقی کے ہاتھ سے گرتے ہوئے ساغر کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں۔ اخترؔ کے افسانے اسکا بہترین تعارف ہیں۔

اور اس کتاب کے ناشر مبارکباد کے حقدار ہیں کہ انھوں نے اخترؔ کو دنیائے

ادب سے رُوشناش کرنے میں اس نوجوان سے تعارف کیا۔

قمرؔ جلال آبادی

پربھات فلم کمپنی - پونا۔

۲۶ر جولائی ۱۹۴۵ء

۱

شاعر کی دُعا

بہار کی مدہوش کن چاندنی رات تھی۔ ماہتاب سیم پاش تھا۔ اس کی روپہلی کرنیں فضا میں رقصاں تھیں۔ گھنے درختوں کی شاخوں میں چاندنی اونگھ رہی تھی پھولوں کی عطر بیز ہوا نے فضا میں مہک پیدا کر دی تھی۔ نیند کی حسین ساحرہ نے تمام دنیا کو مسحور کر دیا تھا فضا میں دُور —— بہت دُور۔ کبھی کبھی فرقت زدہ کوئل کی کوک سُنائی دیتی تھی۔

ایک فلسفی شاعر۔ درماندگی کا پیکر۔ افکار و آلام کی زندہ تصویر جس کی آنکھوں سے نیند کافور ہو چکی تھی اور حسین خوابوں کی دنیا غم واندوہ کی پہنائیوں میں گم ہو چکی تھی (آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار رواں۔ جیسے گنگا جمنا کا سنجوگ) یوں گویا ہوا۔

اے الھڑ اور انجان۔ اے شعریت کی دیوی۔ اے سرو قد۔ رعنائی حُسن کی تصویر حسین و جمیل مرمریں مجسمے۔ اے مغرور عشوہ طراز۔ شاہانہ غرور و تمکنت کی زندہ مورت مجھے تجھ سے محبت ہے والہانہ محبّت۔ میرے دلآویز خوابوں کی سُہانی دنیا پامال ہو چکی ہے۔

میری زندگی مسرتوں سے معمور تھی۔ میرے لبوں پر تبسم کا ارتعاش تھا۔
لیکن اب —— یاس و حرمان کی تصویر ہوں۔
میرے دل میں تمناؤں نے طوفان بپا کر رکھا ہے
تیری مفارقت نے میرے دل حزیں پر غم کی بجلیاں گرا دی ہیں۔
آ۔ اے شعریت کی دیوی آ
اور اپنے حُسن لایزال کے نور سے میرے دل کی تاریکی کو مبدل بہ نور کر دے
میری خفتہ آرزوں کو بیدار کر دے۔!

آخر!
وہ آ ہی گئی جس کے لئے شاعر سراپا انتظار تھا۔
نورجمال کا ایک ٹکڑا۔ غیرت صدچمن۔ شاہد دلربا۔ ہر حرکت سے حُسن نمودار۔ ہر ادا سے غرور ہویدا۔ ہر قدم فتنہ خیز۔ حشر بدوش۔ اُبھرا ابھار۔ سر پر کرنوں کا تاج۔ مدھ بھری آنکھیں آسمانی کواکب وار فرغل میں ملبوس فضا خوشبو سے معمور ہو گئی۔ وہ آتے ہی یوں گویا ہوئی۔
"اے شاعر! کائنات زندگی کی تفسیر۔ فطرت کے رازداں۔ سرگشتۂ حزن و ملال۔ سراپا سوگوار۔ الم نصیب۔ اے مجنون۔ اے نقیب قوم و وطن۔ عکاس جذبات۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ تیری دعائیں مجھے یہاں کشاں کشاں کھینچ لائی ہیں"۔
شاعر نے ملتجی نگاہوں سے دیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔
"اے دیوی۔ مجھے تخیل۔ تاثیر۔ سوز و گداز عطا کر دے:

جوگی

جوگی اپنی بین زمین پر رکھتے ہوئے یوں گویا ہوا

"میں بین اچھی طرح بجا سکتا ہوں"

اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ ایسے جیسے کوئی عادی میخوار ہو۔

اس کی لمبی لمبی جٹائیں شانوں پر لاابالیانہ انداز سے منتشر تھیں۔ اس کی ریش دراز جسکے خط بنے ایک عرصہ دراز ہو چکا تھا گیر دے رنگ کے چاک گریبان کو چھو رہی تھی۔ اُسکا ماتھا شکن آلود تھا۔ اُسکے چھدے ہوئے کانوں میں بھورے بھورے رنگ کے مُندرے لٹک رہے تھے۔

"ہاں میں رسیلی سروں میں بین بجا سکتا ہوں"

میں نے یہ دلکش راگنی عندلیب زار سے حاصل کی ہے۔ میں نے یہ زیر و بم جنگل کی آزاد ہوا سے سیکھا ہے۔ میں نے یہ گیت پہاڑی ندی کے گیتوں سے اکتساب کیا ہے۔

میری بین میں اضطراب اور سوز و گداز ہے۔

مَیں نے یہ مضطرب نغمہ مضطرب پپیہے کی "پی کہاں" سے لیا ہے۔
مَیں نے یہ سوز و گداز کوئل کی کوک سے چُرایا ہے۔
میری بین میں موسیقی مچل رہی ہے۔
اگرچہ میرے لب شعریت کے لئے ناموزوں ہیں۔
لیکن! میری بین میں موسیقی و شعریت کا بے پایاں سمندر ہے جس کی متلاطم امواج عالمگیر ہیں۔
میں راگ سے مسحور ہو کر اس کی گلابی گلابی آنکھوں کو دیکھا کیا۔
موسیقی میری نس نس میں سما گئی - موسیقی میرے دل کی پنہائیوں میں بس گئی۔

میں نے بیکل ہو کر شہر اور شہر کی رنگینیوں کو تج دینے کی ٹھان لی۔ آخر میں نے ان ہنگامہ خیز دلچسپیوں کو خیر باد کہدیا۔ اور چلدیا۔ ابدی زندگی حاصل کرنے کے لئے۔ مضطرب روح کو قرار دینے کے لئے۔ میں نے طوفان بپا کرنے والی بین کا حشر بداماں نغمہ سنا۔ میں ایک عرصہ تک جنگلوں میں گھوما کیا۔ میں نے مرغزاروں میں لالہ کو مرجھائے ہوئے دیکھا۔ پہاڑی ندی پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ عندلیب سرد آہیں بھر رہی تھی۔ پپیہا "پی" کے فراق میں گھائل ہو چکا تھا۔ آموں میں بور آ گیا تھا۔ کوئل دُور، بہت دُور باغوں میں چلی گئی تھی۔
مَیں نے جوگی کی سیاہ آنکھوں کو دیکھا...... نیم وا...... سُرخ سُرخ ڈوروں میں کھوئی ہوئی۔

مَیں نے جوگی کی بین پر ایک نظر ڈالی۔ اُس میں موسیقی و شعریت کا ایک بحر بیکراں اب بھی موجزن تھا جس کی موجیں عالمگیر تھیں لیکن بین پژمردہ ہوچکا تھا۔ سکوت کی زندگی سے بیزار............

جاوید آجاؤ

(جاوید مرحوم کے نام)

رات بیوہ کے مستقبل سے زیادہ تاریک تھی۔ ہر سمت موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ جب وہ مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ آہ! اس کی ننھی سی روح بھیانک تاریکی سے دوچار ہوئی ہوگی۔

آج کی رات اس سے بھی زیادہ تیرہ وتار ہے۔ جبکہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہوگیا۔ میں اپنے جاوید کو پکار رہی ہوں۔ اے ننھے میرا آغوش تمہارے لئے بیتابانہ وا ہے۔ دنیا نیند میں کھوئی ہے۔ ننھے ننھے ستارے باہم سرگوشیوں میں مشغول ہیں۔

آجاؤ...... میرے ننھے ایسے میں کوئی بھی نہ جان سکیگا۔

ابھی بہار کا آغاز ہی تھا کہ موت کے بیرحم ہاتھوں نے ایک ننھی سی کلی کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دیا۔ سرخ کلیاں مسکرا رہی ہیں۔ درخت سبز لباس زیب تن کر رہے ہیں۔ یاسمن کی بھینی بھینی خوشبو سے صحن چمن بسا ہوا ہے۔ بہار نکھار پہ ہے۔

میرے جاوید ... آجاؤ۔ تیرے بھولی والہانہ انداز میں مسرت و شادمانی سے بیخود ہوکر سورج مکھی کی پتیاں فضا میں بکھیر رہے ہیں۔

میرے ننھے آجاؤ ..... ایسے میں کوئی بھی نہ جان سکے گا۔

قدرت کے ننھے کھلونے صحن چمن میں کھیل کود میں مشغول ہیں۔ ہفت اقلیم کی دولت بھی اُن کے آگے ہیچ ہے۔ اُن کے بلند سیمیں قہقہے فضا میں لہرا رہے ہیں لیکن اُن میں وہ مرغوب ترین آواز جو میرے کانوں میں رس گھول دیتی تھی، مفقود ہے۔ جب میں اس کھڑکی میں بیٹھتی ہوں۔ جسے ہارسنگھار کے پھولوں نے ڈھانپ رکھا ہے تو میں پکارتی ہوں۔

آجاؤ .... میرے ننھے آجاؤ۔

تمہاری ماں کا دل تمہارے فراق کے صدمے سے پاش پاش ہوچکا ہے۔ اس کی آنکھیں تمہارے انتظار میں سراپا انتظار ہیں۔ تمہاری میٹھی میٹھی آواز سننے کے لئے اسکے کان بیتاب ہیں۔ ننھے اگر تم ایک لمحہ کے لئے اپنے سرخ سرخ دمکتے گالوں کا بوسہ دے جاؤ تو ایسے میں کوئی نہ جان سکیگا ....

شہر خموشاں کے مکیں کس سکون و اطمینان سے سو رہے ہیں۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ ایک طرف مٹی کی تازہ ڈھیری جس پر گھاس رینگ رہی ہے، تیری ابدی آرام گاہ کا پتہ دے رہی ہے میں خاموشی کی رو میں بہے جاتی ہوں۔ اچانک فاختہ کی "کوکو" اس طلسم سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ اور یہ آواز مجھے اس معصوم کی یاد دلاتی ہے، جو میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ جو میری گود میں بیٹھکر اپنی توتلی زبان میں

دلکش گیت سُنایا کرتا تھا

میں پکارتی ہوں - آجاؤ - میرے ننھے جاوید آجاؤ -

آہ! تم کیوں اپنی پیاری ماں کو فراموش کر بیٹھے ہو۔ تمہاری غمگین ماں تمہارے لئے سراپا انتظار ہے۔ میرے ننھے! اگر تم گیت سنانے کے لئے ایک لمحہ کے لئے آجاؤ تو کوئی بھی نہ جان سکیگا۔

ایک رومان بھری رات

چاندنی رات تھی —— ہر طرف نور کی روپہلی چادر بچھی ہوئی تھی ——

ہر چہار سو ......

دریا کا کنارہ تھا —— ماہتاب کی کشتی نور کی بیقرار لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ خاموشی نے —— سکوت کے نغمے الاپ کر ہر چیز کو مدہوش بنا دیا تھا ——

خودرو پھول، شراب نکہت انڈیل رہے تھے۔

ہواؤں میں آوارہ پھر رہی تھیں، ان کی خوشبوئیں۔

میری خورشید —— میرے پہلو میں تھی —— تماشہ دیکھ رہے تھے ہم —— مچلتی لہروں کا ——

مستی چھلک رہی تھی اس کی آنکھوں سے —— ہنس رہی تھیں وہ آنکھیں۔ ——

لب متبسم تھے۔ —— گویا مسکراہٹ ناچ رہی تھی —— برگ گلاب ایسے نازک ہونٹوں پہ ——

میری خورشید — میرے دل کی دنیا میں — اور میں — خورشید
کے دل کی دنیا میں !
کھو گئے تھے ہم دونوں — سمٹ گئے تھے ہم دونوں
ایک دوسرے میں ۔
ہم دونوں محبت کے جھولے میں دیکھ رہے — منوہر سپنے
بڑے دلفریب تھے یہ خواب — میرے دل پر نقش ہیں
اُس رومان سے بھرپور رات کے لمحات
وہ کبھی نہ بھولنے والی گھڑیاں — آہ وہ رات جو بیت گئی

نہ صرف مَیں ۔ بلکہ میری خورشید ۔ میری دنیائے محبّت بھی منتظر ہوگی
اس رومانی رات کی ۔ کیا عجب وہ میرے خیالی مجسّمہ سے مخاطب ہوکر
کہہ رہی ہو ۔
"میری راتیں کتنی بے کیف ہیں ۔ تیرے بغیر ۔ بالم اور وہ رات ۔ کتنی دلفریب
کیف آگین تھی
کتنی سُندر تھی جیون کی وہ رات ۔"

نغمۂ حیات

زندگی — اک نغمہ ہے — ابدی و سرمدی
زندگی — اِک گیت ہے — ترنم ریز — کیف آگیں۔
مدُھر گیت ہے — جھرنے کا۔
مسحور کُن ہے — پھولوں کی مہک سے بھی۔
زندگی کا راگ ہے میٹھا — حوروں کی پازیب کی جھنکار سے بھی۔
مگر آتا ہے اک لمحہ ایسا بھی — سراپا سوز بن جاتا ہے یہ نغمہ۔
شیرینی کھو دیتا ہے — یہ راگ میٹھا۔
رسیلی تانیں اس کی — بن جاتی ہیں آہیں۔
جوشِ زیر و بم میں — طوفان اُٹھتا ہے آہ و شیون کا۔
ہو جاتا ہے طاری — اضطرابِ پیہم — بساطِ روح پر
آہ یہ لمحے کچھ بھی نہیں۔
منوہر گیت زندگی کا بن جاتا ہے اک سپنا۔

راگ کا جادو

چاندنی کا دریا لہریں لہریں لے رہا تھا۔ ماہتاب کا حسن پورے جوبن پر تھا۔ دریا کے دھارے پر ایک کشتی ہولے ہولے بہہ رہی تھی۔ ملکۂ موسیقی شباب کی مستیوں میں مخمور اپنی مرمری انگلیوں سے بربط کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ گستاخ کرنیں اس کے لانبے لانبے سیاہ بالوں سے شوخیاں کر رہی تھیں

ایک شاعر جسکا لباس حاجتِ رفو سے بے نیاز تھا، راگ سن رہا تھا۔ اُسپر بیخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ ماحول سے بے پروا ہو کر اسکے زیر و بم پر سر دُھن رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ اس نے دعا مانگی۔

"اے مالک! مجھ سے میری بینائی۔ توانائی۔ سب کچھ لے لے۔ اور صرف یہ سوز! یہ لے!! یہ ترنم!!! اور یہ درد مجھے عطا کر دے۔

شاعر نے کشتی کی جھلک دیکھی۔ اگلے لمحے اس کی آنکھیں بے بصر تھیں۔ اس کی آواز میں درد تھا۔ ترنم تھا۔ اک سوز تھا۔

وہ ہاتھوں میں بربط لئے ہوئے خود ساختہ گیت گاتا۔ اور اُسپر محویت کا عالم

طاری ہوجاتا۔ لوگ اُسکے نغمے سُنکر عالمِ کیف میں گُم ہو جاتے۔ لیکن شاعر ان کیفیات سے بے خبر تھا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔

وہ رات پھر کبھی نہ آئے گی

بہار کی مدہوش کن چاندنی رات تھی۔ نزہت بار اور دلکش۔ ہر سُو ہجوم گل تھا۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے صحن چمن بسا ہُوا تھا۔ درختوں کی کونپلوں سے کونپلوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ گلاب کی ننھی اور نازک شاخیں ہزار در ہزار پھولوں سے جھکی پڑتی تھیں

شگوفوں سے پھولوں کی رنگت ہویدا تھی۔ پھول پھول کے کان میں راز الفت افشا کر رہا تھا

چاند کی سیمیں کرنیں آسمانی وسعتوں کو چیرتی ہوئی گھنے گھنے درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ بردائے کبود پر موجِ نور کے قطرے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ بہار کی یہ دلنوازیاں۔ جانفزائیاں۔ کیف پرور اور مسحور کن تھیں۔

خورشیدہ میری پیاری خورشیدہ! ہلکے پیازی رنگ کی ستارہ مثال ساڑھی میں ملبوس، مولسری کی لہلہاتی معطر سبز روش پر جوہی کی ننھی کلی کی طرح شرابِ جوانی

سے مخمور۔ میری باہوں میں اپنی نازک سیمیں باہیں ڈالے محوِ گلگشت تھی۔
مولسری کی کھلتی ہوئی خوشبودار شاخوں میں وہ فردوس بریں کی حور دکھائی دیتی تھی۔
میں نے کہا" میری اپنی خورشیدہ۔ میں تمہارے لئے کچھ پھول توڑ لوں"
گلاب کی نیم وا کلیاں پیش کرتے ہوئے میں نے کہا۔
" میری ننھی خوبصورت تتلی۔ ہماری محبت لافانی ہے۔ یہ جوان رہے گی۔ جب تک مہر و ماہ قائم ہیں"
وہ لجا سی گئی۔ یاسمن کی مخمور کلی کی طرح۔
وہ والہانہ انداز میں زیر لب دھیرے دھیرے یہ گیت گنگنا رہی تھی۔
" میرے محبوب! ہم یہاں جدا ہو جائیں گے۔ میرا راستہ اسطرف جاتا ہے اور تیرا راستہ وہ ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ میرے محبوب!
" شریر لڑکی۔ مجھے دق کرنے کے لئے کیا یہی گیت رہ گیا تھا۔ ہم جدا ہو جائیں گے میرے محبوب!"
گلستاں کی چنچل دوشیزگاں آنکھ مچولی کھیلنے میں مشغول تھیں
دور۔ پرے۔ سر و پر۔ کیوپڈ کے سنہری تیروں کے شکار دو پرندے ایک دوسرے کو پریم سندیس دے رہے تھے۔
جونہی یہ دردناک گیت ختم ہوا۔
ہم جدا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں۔

کیا یہ شگون بد تھا ۔ میری خورشیدہ کی جُدائی کا ۔
کیا یہ المناک گیت ———
اس رومان غم کی تفسیر تھی ۔ ہم جُدا ہو جائیں گے ۔
ہمیشہ کے لیے جُدا ہو جائیں گے ۔

بہار اب بھی آتی ہے ۔
لالہ گلشن میں آگ لگا دیتا ہے
بھونرا مست ہو کر گلاب کے گرد رقص کرتا ہے ۔
تیتریاں ۔ گلستاں کی ننھی پریاں ۔
اب بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں ——— چاندنی راتوں میں
لیکن ——— خورشیدہ اور میں ۔
اب کبھی اکٹھے سیر کو نہیں جاتے ۔
خورشیدہ کو آسمان نے مجھ سے جدا کر دیا ۔

اور اب لمحات تنہائی میں ——— میں سوچتا ہوں ۔
کیا یہ آخری گیت تھا ——— "میرے محبوب ہم جُدا ہو جائیں گے"
اکثر شب تنہائی میں ان بیتے ہوئے خوشگوار لمحات پر غور کرتا ہوں ۔ تو یہ
گذری ہوئی دلچسپیاں اور انکی ناکامیاں میرے دل پر اپنا عکس ڈالتی ہیں ۔
میں بے اختیار ہو کر کہتا ہوں ۔
" دلِ حزیں " وہ رات پھر کبھی نہ آئے گی ۔

جُدائی کے تیر

وہ آئے ـــ جُدائی کے وقت ـــ ملنے کے لئے۔ گلے سے ملے اور
جُدا ہو گئے۔ ایسے جس طرح سپیدۂ سحر سے لیلئے شب
تھوڑی دُور گئے۔ اور ٹھہر گئے۔ خدا معلوم کیا سوچکر۔
چار آنکھیں ـــ اُٹھیں ـــ ملیں ـــ ان میں حسرت جھلک
رہی تھی۔
محبت سے لبریز تھیں یہ آنکھیں ـــ ان میں ارمان بھی تھا۔ یاس
اور آرزو بھی۔
آنکھوں کی گنگا جمنا سے لہریں اُٹھیں۔
پلکوں کے قدم چوم کر طوفان بداماں آگے بڑھیں۔
اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔
ایسے جسطرح ساون بھادون گلے مِل رہے ہوں۔

.....((۲))......

پہلے آکاش پر ـــ بادل چھا گئے ـــ کاجل کی طرح سیاہ

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ "محبوب تم جدا ہو رہے"
"ہاں" اس کا جواب تھا۔ میں کھو یا گیا یہ سُنکر
میری امیدوں کی دنیا میں ایک ہلچل سی بپا ہوگئی۔
میں نے آہستہ سے کہا
میرے محبوب! تمہاری جُدائی پر۔ میری صُبح مسرت شام غم سے بدل رہی ہے۔
مختصر سی پریت ـــ اور اس کا یہ انجام کسقدر اندوہناک ہے یہ مآل۔
اُسکی یاد ـــ کیا اب یادِ عشرتِ ماضی کہلائے گی۔

((۳))

تم جُدا ہو رہے ہو۔ میرے محبوب ـ لیکن ـ کون جانتا ہے
میری یہ تشنہ کام آنکھیں ـ کب دید سے سیراب ہوں۔
یہ دلِ محزوں دُہرائیگا۔ سکوت سے لبریز۔ کنج تنہائی میں۔
بصد حسرت ویاس۔ گذری ہوئی داستان محبت ـــ دنیائے الفت کی رنگین کہانی۔

تم جُدا ہو رہے ہو میرے محبوب
کیا یہ دلِ حزیں نہ تڑپے گا۔ جب یہ یاد کریگا۔ خمستان محبت کے ان ساغروں کو۔
جن کی ارغوانی شراب نے۔ ان کو مدہوش بنائے رکھا۔

کیا یہ دل بیقرار نہ ہوگا۔ بزمِ ناز کی گذری ہوئی کہانیوں کو یاد کر کے

...((۴))...

میرے محبوب! تم جدا ہو رہے ہو۔
ایسے جس طرح ــــ موسمِ خزاں میں ایک کمزور زرد سا پتّہ ــــ بادِ تند سے اُڑ کر
پانی میں بہہ کر ــــ شاخ سے بہت دُور ــــ بہت ہی دُور ــــ چلا جاتا ہے۔
میرے محبوب تم جدا ہو رہے ہو
تم خرمنِ دل، پہ برق گرا رہے ہو۔
باغِ انبساط میں
اِک نازک سے کاشانہ کو جلا کر ــــ راکھ کا ڈھیر بنا رہے ہو ــــ
لیکن اے محبوب۔ اس دل میں۔ دل کی گہرائیوں میں
اس لامکاں وسعتوں کے مالک۔ دل میں۔ ایک ننّھا سا۔ مگر محفوظ
ترین کاشانہ ہے۔

...((۵))...

اس میں تمہاری یاد رہے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔
اے میرے محبوب ہم جدا ہو جائیں
یہ تو قضا و قدر کے نوشتہ میں
روزِ ازل سے ہی لکھا جا چکا ہے ــــ کس قدر زبردست ہے ــــ یہ
نظامِ قدرت ــــ

ہم جُدا ہو جائیں —تُم اور مَیں— مَیں اور تُم
لیکن میرے محبوب!
فاصلہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو— یہ تمہاری یادوں میں حائل نہیں ہو سکتا
وقت نے — بے رحم وقت نے— ہمارے درمیان
حائل کر دی ہے اک خلیج

""...((۶))...""

جُدائی کی۔ اضطراب کی۔ مہجوری کی۔
اور ایسے میں تم جُدا ہو رہے ہو۔ اے میرے محبوب
لیکن ہر لحظہ۔ ہر گھڑی۔ ہر لمحہ — تمہاری یاد کا بادل
چھایا رہیگا۔ اس دل کے آکاش پر۔
اور میں ہر قطرۂ چکیدہ کو۔ صدفِ دل میں موتی بنا کر
اور ان کو ہر رگِ جاں میں پرو کر— تمہاری یاد کے ہار پہناؤں گا دِلکو۔
تُم جُدا ہو رہے ہو۔ محبوب
لیکن۔ خلوص۔ محبّت۔ دوستی کی یادگار سب سے زیادہ زبردست ہے۔
تُم جُدا ہو رہے ہو— میرے دل کے مکین —!

بیوفا سے

چاندنی رات ہے۔ میں تنہا ندی کے کنارے۔ایک پُرانے درخت کے سایہ تلے۔ دُنیائے یاد میں کھویا ہُوا کھڑا ہوں۔ چاندکی شوخ کرنیں اپنا نقرئی عکس صاف و شفاف پانی پر ڈال رہی ہیں۔ گو یا شوخ اور چنچل پریاں ندی کی لہروں پہ رقصاں ہیں۔ موسیقی کے لامحدود چشمے اُس کی روانی میں پنہاں ہیں میں اپنے دل میں ایک خامشی۔ افسردگی پا رہا ہوں میرا دلِ حزیں متلاشی ہے۔ اسی شب منور کو ڈھونڈ رہی ہیں میری آنکھیں ــــ شب سیمیں کے ان نظّاروں کو جن سے یہ اسی ندی کے کنارے چھٹکی ہوئی چاندنی اور جگمگاتے ہوئے ستاروں میں لُطف اندوز ہوئیں ــــ جب میں اور خورشیدہ جیون کے ساتھیوں کی طرح مسرّت کی دنیا میں۔ زندگی کے ایّام بسر کر رہے تھے۔

٭

رات اب بھی چاندنی ہے۔ وہی نظارے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔
لیکن ــــ میری ــــ اے کاش میری تمنّاؤں کی دیوی ــــ تمہیں معلوم ہوتا۔
اے کاش میری جان تو دیکھتی میرے دل کی دنیا کو۔ یہ تاریک ہے۔
اس میں ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں۔ تیرے بغیر میری خورشیدہ۔

اس میں روشنی کی جان پرور اور حیات بخش شعاعِ اُمید کا گذر تک نہیں۔
اسمیں تاریکیاں ہیں تیرے بغیر میری زندگی کی راحت نواز روشنی پر سیاہ گھٹائیں چھا گئیں۔
تم نے مجھے بُھلا دیا۔ نجانے کیوں۔ میں نے زندگی کی چند ساعتیں جو تمہارے ساتھ بسر کی ہیں۔
اُن کی یادوں میں اپنے دکھ بھرے جیون۔ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جیون کو گذار دوں گا۔
میں کیسے محو کر دوں۔ اُن تمام نقوش کو۔ جو میرے دل و جگر پر اپنا ایک ایسا اثر چھوڑ گئے ہیں
جن کو مٹانا۔ فراموش کرنا۔ بُھلانا میرے بس کی بات نہیں۔ تمہاری جُدائی نے
مجھے خوشیوں کی دنیا سے الگ کر دیا ہے۔ لیکن تمہاری یاد کی حسین ترین تصویر میرے ساتھ قبر میں ہی جا کر دفن ہوگی۔

...(۳)...

حُسن و نکہت کی مست راتوں میں۔ چاندنی راتوں میں۔ اسی ندی کے کنارے۔ جب فضا خود رو پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی تم نے وعدہ کیا تھا۔ جب تک دم میں دم ہے۔ میری ہی رہو گی۔
جگمگاتے ہوئے ستارے ہماری محبت کے گواہ تھے۔

تُم نے کہا تھا "میرے دل پر تمہاری حکمرانی ہے۔ اس میں کوئی اور نہیں بس سکتا۔"

"یہ دل تمہارے لئے وقف ہو چکا ہے۔"

او ستمگر ــــ بیوفا ــــ وعدہ فراموش۔

تم سے یہ کیسے ہو سکا کہ اِک پاگل پریمی کو روتا ہوا چھوڑ دیا۔
جِس نے اپنا شباب۔ اپنے نغمے۔ تمہاری نذر کر دیئے۔
کیا تم نے ایسا کرتے ہوئے کوئی دکھ۔ کوئی درد۔ کوئی خوف محسوس نہ کیا؟
کیا تم نے میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں آرزوؤں کا ایک بے پایاں سمندر نہ پایا۔
میں تم سے محبّت ہی نہ کرتا تھا بلکہ ایک عقیدت مند پجاری کی طرح پوجتا تھا
میں تمہاری محبت میں دُنیا و مافیہا کو بھُول چکا تھا۔

...((۴))...

اب میرے لئے اس دنیا میں باقی کیا رہ گیا ہے۔
میری زندگی میں شادمانی و مسرّت کا کیا کام۔
مجھ سے راحتیں۔ مُسرّتیں۔ سمندر کی لہروں کی طرح دُور بہت دور جا چکی ہیں۔

تمہاری یاد مجھے تڑپائیگی۔ رُلائے گی۔ کلپائیگی۔ بیکل بنائے گی۔ اور مَیں شبنم کی طرح خاموش آنسو بہایا کروں گا
تم ایک مسافر کی طرح میری زندگی کے باغِ شباب میں داخل ہوئیں۔

چند ساعتیں بسر کیں — اور چلتے وقت کلیوں کو بھی مسل دیا

....((۵))....

میں دیر تک — بہت ہی دیر تک اِن ہی خیالوں میں منہمک رہا۔
یکایک پرندۂ شب کی خوفناک آواز نے مجھے چونکا دیا۔
انجم کا بکھرا سا قافلہ حرکت میں تھا۔ ماہتاب کا چہرہ بھی مضمحل و نیمجاں مریض کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ پرے۔ درختوں کے جُھنڈ کے پیچھے جا رہا تھا۔
تیرگی ہر سُو مسلط ہو رہی تھی۔ فضا اداس و ملول تھی۔ ہر طرف۔ خاموشی۔ سکوت۔ اُداسی تھی۔
"آہ وہ چاندنی راتیں"

"پجارن"

(۱)

اِک چھوٹا سا مندر ہے ــــ اس پہاڑی کے دامن میں
جہاں شاہ خاور شام کو ــــ شفق کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے
اِک چھوٹا سا مندر ہے

(۲)

اُس مندر میں اِک مورتی ہے ــــ سُندر دیوتا کی
اور مَیں اُس کی پجارن ہوں ــــ اپنے دیوتا کی پوجارن
ہر روز ــــ سویرے ہی سویرے
جب سورج دیوتا ــــ اپنی سُنہری رتھ میں ــــ کرنوں کے تیر برساتا
مشرق کی سمت سے آتا ہے۔

(۳)

مَیں خودرو پھولوں کا ہار پرو کر
دیوتا کی پوجا کے لیے آتی ہوں اس مندر میں

اور پھر آنکھوں کی گنگا جمنا سے جل لیکر دیوتا پر چڑھاتی ہوں۔
جھکا دیتی ہوں اپنے سر کو۔۔۔ بڑے خلوص اور عقیدت سے۔ دیوتا کے
حضور میں
اور پرارتھنا کرتی ہوں۔ موہن کے درشنوں کے لئے
کسی روز تو قبول ہوگی ۔۔۔ میری پرارتھنا ۔۔۔ مجھ ابھاگن کی
اور میرے دیوتا۔ اپنے داسی کے گھر آئیں گے۔

پردیسی پیتم کے نام

سکھی!

پریتم تو پردیس جا بسے —— میری روح کے بربط کے تاروں میں ارتعاش
پیدا کر کے

خیال آتے ہیں اُس پردیسی کے

جیسے شاہراہ پر راہگیر ہوں گذرتے۔

نہ جانے کب آئیں گے —— پیتم میرے

بیت جاتا ہے دن —— راہ تکتے تکتے

لوٹ آتے ہیں پرندے —— شام کے دھندلکے میں ——
گھنیرے جنگل سے۔

لیکن —— سکھی

پیتم تو آتے ہی نہیں بسیرے۔

رات کی تاریکی چھا جاتی ہے ـــــ ہر شے پہ
تیرگی ہی تیرگی ـــــ ہو جاتی ہے ہر جا
کھو جاتی ہوں مَیں ـــــ اس کے خیالوں میں ـــــ روتے روتے

اور اگر ـــــ نیند ہی چھا جائے

تو

خواب میں بھی تو

وہ نہیں آتے ـــــ

اُفق کے اُس پار

اُفق کے اُس پار ایک فردوسی بستی ہے ۔جہاں مسکراتی ہوئی کرنیں۔
دیوقامت درختوں سے کھیلتی ہوئی شفق کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
پربت کی بلند چوٹیوں کے پیچھے چھپ جاتی ہیں۔ اس بستی کی دلچسپیاں ۔حسین
نیندوں کے دلکش خوابوں میں ہلچل بپا کرتی ہیں ۔میرے دلدار
اُس کی نزہت بار کیف آور ۔دلنشین فضا میں محبت کی رنگین کہانیاں دہرانا
جُرم نہیں میرے دلدار۔
اس بستی میں ایام محبت ملکوتی خوشیوں میں بسر کیئے جاتے ہیں۔ اسکی
عطر بیز فتنہ زا فضاؤں میں اودی اودی ۔نیلی نیلی، بھوری بھوری بدلیاں
مدہوش شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہیں۔
اس سرزمین پر ماہتاب اپنے پورے جوبن سے مُسکراتا ہے اور اسکے
جاں نواز تبسم کے سایہ تلے ایک ندی کبھی نہ ختم ہونے والا گیت والہانہ انداز
میں گاتی ہوئی بہتی ہے ۔جیسے اکثر تم یہ گیت "تم بھی پریت کرو تو جانو" دھیرے
دھیرے گنگنایا کرتے ہو۔ کسی چنچل دوشیزہ کی طرح آرام سے نہ بیٹھنے والی شوخ

لہریں اس مدھ بھری فضا میں کرنوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ اے میرے دلدار۔ اس پاک بستی کی فضاؤں میں معصوم موسیقی لہراتی ہے۔
اس سرزمین پر محبت کی رنگین و دلکش کہانی کو المناک افسانہ نہیں بنایا جاتا۔

اس جنت نظیر فردوس نگاہ بستی میں طائران خوشنوا اپنے خوش ائیند ترانوں میں نغماتِ الفت الاپتے ہیں۔ اے میرے دلدار
اس سرزمین پر پھول پھول سے۔ کلی کلی سے اپنا رازِ محبت برملا کہدیتی ہیں
یہی ایک بستی ہے جہاں ہر صبح شاہ خاور کی سنہری شعاؤں میں اور ہر شام ماہتاب کی سیمیں کرنوں میں پریم کے گیت لہراتے ہیں لیکن میرے دلدار۔ پھر بھی اس رومان پرور بستی کا رومان مکمل نہیں۔ تیرے بغیر۔
آؤ میرے دلدار! اس دنیا سے الگ پریم کی اک نئی بستی بسائیں۔

جذبۂ سفر

طلوعِ آفتاب کا نظارہ مشرق کی سمت
بحرِ بیکراں مغرب میں
مشرق و مغرب کے نظارے مجھے اپنی جانب بلا رہے ہیں۔
یہ سفید سڑک کدھر جاتی ہے — وہ نیلی پہاڑیاں کہاں ہیں ؟
لیکن سورج اور ستارے میری رہنمائی کریں گے
وہ افق سامنے دکھائی دیتا ہے
ہر روز نئے اور پرانے جہاز وہاں آتے ہیں۔
ممکن ہے میں واپس آ جاؤں۔
لیکن اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔
اگر تم سے کوئی پوچھے کہ وہ کہاں ہے ؟
تو کہنا — کہ نیلگوں آسمان — بحرِ بیکراں —
یہ ننھے ستارے — یہ سرسبز پہاڑیاں
اس کے ذمہ دار ہیں۔

لیکن اب یہ نظارے مجھے اپنی جانب بُلا رہے ہیں

الوداع !

(ترجمہ)

مسافر

مَیں غمزدہ بادلوں کے برفانی تودوں کی طرف دیکھ رہی تھی
سرد سرد ہوا سائیں سائیں کرکے چل رہی تھی۔ ایسی سرد جیسے بیوفا دوستوں کی
سرد مہری۔
کسی نے دھیرے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "سکھی کوئی مسافر
آیا ہے"
مَیں نے سُنا اور چونک اٹھی۔ جیسے باد تُند میں گلاب کی ننھی ننھی کونپلیں
مَیں نے کہا۔ اُس سے کہو میرے کاشانے کو منور کرے۔

وہ ایک بھولا بھالا نوجوان تھا۔ اُس کے گلابی لب متبسم تھے۔
میں نے کہا "مسافر ٹھنڈا پانی پیو گے"
اس نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ مَیں نے اُسکے پاؤں دُھلائے
پھر چاندی کے کٹورے میں ٹھنڈا پانی پلایا۔
"کس دیس سے آرہے ہو مسافر" میں نے پوچھا

"بڑی دُور سے۔ بہت دُور سے۔ وطن کو چھوڑ کر — بے وطن ہوکر"

"کیسا ہے تیرا دیس — مسافر"

اُس کی رسیلی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ہلکے ہلکے سُرخ رخساروں پر گرم گرم قطرے ڈھلک پڑے

"میرا دیس فردوس کی مانند ہے۔ پھولوں پر بلبلیں نغمہ ریز ہیں۔ باغوں میں طوفانِ حُسن وجمال بپا ہے۔ اس کے دریا برفانی پہاڑوں سے آتے ہیں۔ اُن کی لہریں سیماب کی طرح بیقرار ہیں۔ میرے دیس کی میٹھی فضاؤں میں موسیقی رقص کرتی ہے۔

گھنے درختوں کے سایہ تلے۔ ٹھنڈے رواں چشموں میں۔ ننھّے ننھّے بچّے کاغذ کی ننھّی ننھّی ناؤ تیراتے ہیں۔

مسافر اتنا کہہ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "کہاں جاؤ گے مسافر" — جہاں قسمت لے جائے:

میں نے کہا "مسافر۔ تو نے میرا دل موہ لیا ہے۔ تیرے پاس موہنی ہے"

وہ وطن کی یاد میں رو رہا تھا۔

اور میں اس کی جُدائی سے بیتاب ہوکر رو رہی تھی۔ ایسے جس طرح ساون بھادوں کی جھڑیوں میں دریا کی لہریں پروانہ وار ساحل کے قدم چومنے کو بیقرار ہوکر دوڑتی ہیں۔

لیکن آہ! وہ الوداع کہہ کر چلا گیا —

ساجن کی یاد

ساجن! تم نے مجھے کیوں بھلا دیا۔
میرا دل۔ تمہارے فراق میں بروگ کے گیت گا رہا ہے۔
میری تشنۂ دید آنکھیں پرو رہی ہیں مالا — آنسوؤں کی۔
تم نے مجھے کیوں بھلا دیا ساجن۔
نہ جانے میری یاد کیوں اُتر گئی۔ تمہارے دل سے۔
میں کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ تمہاری لطیف یادوں میں۔
وہ نادان پوچھتے ہیں "تم اُداس کیوں ہو — نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا"
لیکن انھیں کیا معلوم — مجھکو بھلا دیا۔ میرے ساجن نے

—— ۲ ——

میری دنیا تاریک ہو گئی۔
اُس پر تمہاری آنکھ ایسی سیاہ گھٹائیں چھا گئیں
میرے ساجن۔ نہ جانے تم نے کیوں بھلا دیا۔ مجھ حرماں نصیب کو
مجھ سوختہ اختر — بدنصیب کو

تمہاری اس بھول نے ـــــ میرے کاشانۂ راحت کو ـ غمخانہ بنا دیا ہے
تمہاری یاد نے میری تمام راحتوں کو سمیٹ لیا ہے
ایسے جس طرح بھونرا کلی کلی کا رس چوس لیتا ہے ۔
تمہیں معلوم ہے ـ میرے ساجن
اس کے صلہ میں مجھے کیا ملا ۔
کرب ۔ درد ۔ سوز ۔ آہیں ۔ نالے ۔ کسک ۔ تڑپ ۔ الم ۔ یاس ۔ بیقراری ۔
مہجوری ۔ اضطراری ۔ ہمیشہ ستانے والی یاد ۔
تمہارا وعدہ کیا تھا ۔ ایک سراب ۔ ایک فریب تھا ۔ دلفریب
جس کی یاد سے میری آرزوئیں دھڑکتی رہ جاتی ہیں ۔
محبت کی اُن حسین راتوں میں ۔ کتنی دلکشی کتنی رعنائی تھی ۔
وہ تو فردوس کے دلکش خواب تھے
میں کھویا گیا ہوں ـــــ ان کی یادیں
مجھے خبر ہی نہیں ـــ دنیا کی ۔ دنیا کے باسیوں کی
میں دل کی کشتی کو ـــ یادوں کی لہروں پر چھوڑ دیتا ہوں ۔ اور یہ بڑھتی
جاتی ہے ۔ اس بحر بے پایاں میں ۔
اس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ۔
میری یادیں آزاد ـ بیفکر ہوتی ہیں ۔
ـ ہوا کی طرح

یہ آزاد ہیں ــــ گیت کی طرح
کتنی شیرینی ــــ کتنی دلکشی ــ کتنی دلفریبی ۔ کتنی رعنائی ہوتی ہے محبت میں
لیکن ساجن ۔ محبت کتنی اذیت دہ ہے
محبت کسقدر تکلیف دہ ہے
یہ کون جانے ۔ ؟
گذری ہوئی محبت ــــــ الفت رفتہ کی یاد
یہ آگ بھی سرد نہیں ہوتی ۔
اسکو آنسو بھی نہیں بجھا سکتے ۔
یہ شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں ۔ آنسوؤں سے
تم نے مجھے کیوں بھلا دیا ؟ ــــــ کیوں فراموش کر دیا ؟
لیکن تم اپنی یاد ۔ مجھ سے نہیں چھین سکتیں ۔
میں نے تمہاری یاد کو ــــ میری خورشیدہ
میں نے تمہارے خیالوں کو میری خورشیدہ
بٹھا لیا ہے دل کے سنگھاسن پر
اور اُسے پوج رہا ہوں ــــ ایک دیوی کی طرح
کاش کہ میں ــــ انہی یادوں ۔ ان ہی خیالوں میں
کھو جاؤں ۔ گم ہو جاؤں ۔
تمہاری یادمیں میری روح

آزاد ہو جائے —— زندگی کی قید سے ۔
میری خورشیدہ ۔
کیا یہ یادگار نہ ہوگی —— تمہاری یاد کی ۔
ایک زندہ جاوید یادگار —— ابد تک
نہ جانے —— میری خورشیدہ —— تم نے مجھے کیوں بھلا دیا ۔

End

مجھے محبّت ہے

محبوب! مجھے محبت ہے ــــ بے پناہ محبت
آسمان پر مُسکراتے ہوئے چاند کی سیمیں کرنوں سے
محبوب! مجھے محبّت ہے
شفق کی رنگینیوں سے۔ جو عکس ریز ہوتی ہیں۔ ندی کی تھرتھراتی لہروں پر
محبوب! مجھے محبّت ہے
یاسمن کے سفید اور نازک پھولوں سے
جب وہ کہتے ہیں راز محبت۔ جھک جھک کر ایک دوسرے کے کان میں
اور باد سحر کے جھونکے صُبحدم جُھلاتے ہیں۔ جھُولا ان کو۔
محبوب! مجھے محبّت ہے ــــ بے پناہ محبّت
دِل کش گلاب سے
اسکے کنج میں کھو جاتا ہوں ــــ کسی کے حسین تصور میں۔
محبوب! مجھے محبت ہے۔
لالہ کے سُرخ سُرخ پھولوں سے

اسکا داغ جگر دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہوں
یاد آتا ہی زخم جگر اپنا
محبوب! مجھے محبت ہے
نرگس کی مستانہ آنکھوں سے۔ یہ سراپا انتظار ہیں کسی کے انتظار میں۔
محبوب! مجھے محبّت ہے۔
ان تمام سے زیادہ ـــ بہت ہی زیادہ
تمہاری مسکراہٹ سے۔
محبوب! تمہارا یہ تبسم ـــ جو رقصاں ہوتا ہی
تمہارے گلاب کی پتیوں ایسے نازک ہونٹوں پر۔

دیارِ حبیب میں

دیارِ حبیب میں — تمنّاؤں کا — آرزوؤں کا — اِک
طوفان لیکر گیا تھا میں ۔

بیقرار ہو رہا تھا دل — ان کی دید کے لئے — آنکھیں پیاسی
تھیں ۔ اُن کے حُسن ضیا بار کی اک تابش کی

لیکن ۔ انھوں نے
توڑ دیا — میری اُمیدوں کے کھلونوں کو
بڑی بیرحمی سے ۔ گرا دیا ۔ میری امیدوں کے ریت گھروندے کو
اِک آن کی آن میں
اُجڑ گیا — میرا باغ اُمید
پل بھر میں — مُرجھا گئیں ۔
تمناؤں کی کلیاں — کِھلنے سے پیشتر

لوٹ آیا میں

درودیوار پر حسرت بھری اِک نظر ڈال کر
دل میں طوفانِ تمنا لئے
اِن ظالم آنکھوں نے لگا دی۔
جھڑی آنسوؤں کی
اُن کے جلوؤں سے محروم ہو کر

پیا مِلن کی آس

آسمان پر لکہ ہائے ابر دھیرے دھیرے اس کی بیکراں پہنائیوں کو پیرتے ہوئے کبک کی طرح خراماں جارہے تھے۔
طیور نغمات محبّت الاپ رہے تھے۔ ابابیلوں نے جھُومر ڈال رکھا تھا۔
ہوا آوارہ پھر رہی تھی۔ خوشبوئیں مچل رہی تھیں
سبزہ مہک رہا تھا۔ کسقدر صبر شکن تھا یہ نظارہ۔ مدہوش کُن مستی۔
بجلی کی چمک۔ بادل کی کڑک۔ ننھی ننھی بوندیں۔ بوچھاڑ۔ موسلا دھار جل تھل۔ پانی۔ آتا ہ ساگر کیطرح۔
ساون بھادوں گلے مِل کر رو رہے تھے۔ سڑک پر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ہنگامی ندی

مَیں اور خورشیدہ باغ کی بارہ دری میں برسات کا یہ دلنواز منظر۔ شاہد فطرت کی دلنوازیاں۔ جانفزائیاں۔ اور دلفریبیاں دیکھنے میں مصروف تھی۔

ہم کھوئے گئے تھے ۔ اِس مدھ بھری فضاؤں میں ۔
ہم بسا رہے تھے ۔ اپنے من میں محبت کی اِک نئی بستی ۔
لیکن اب ۔ ساون کی رُت ۔ میں میرے لئے وہ کیف نہیں ۔
میرے من میں برہا کی آگ لگی ہوئی ہے ۔
میرے دل پر ساون کی گھنگور گھٹاؤں سے بھی زیادہ
کاری کاری بدریاں چھائی ہوئی ہیں ۔
اور میری آنکھوں نے خورشیدہ کی جدائی میں
ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگا رکھی ہیں ۔
میری ہمنشیں —— میری خورشید
مجھ سے جُدا ہے
پردیسی پریتما ۔ کا خیال ۔

تنہائیوں میں یاد کسی رشک حور کی
بھولی ہوئی وصال کی راتوں کو کرکے یاد

ہلکی سی ایک رو ہے نشاط و سرور کی
فطرت سے بھیک مانگ رہا ہوں سرور کی

طبعزاد

نغمۂ محبّت

ایک شب میں نے اِک فرشتہ کو نغمۂ محبت گاتے ہوئے سُنا
یہ نغمہ اسقدر دلکش تھا کہ میں کہکشاں۔ اور ستارے بیخود ہو کر اسے سُن
رہے تھے،
حتیٰ کہ اسرافیل بھی اپنا سر پروں میں دبائے اِسے ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہا
تھا۔
نغمہ ہولے ہولے فضا میں تھرکتا جا رہا تھا۔
یہ نغمۂ محبت تھا۔ دلکش و کیف نواز
لیکن مجھے یاد پڑتا تھا۔ جیسے یہ نغمہ اِس سے پیشتر سُن چکا ہوں۔
مجھے یاد آیا۔
دوزخ کی گہرائیوں میں۔ تحت الثریٰ میں۔ اس فضائے بیکسی میں
نامرادی کی اِک تصویر۔
اِک زرد رُو۔ دُکھیاری روح نے اِسے الاپا تھا۔ یہ اسقدر غم آگیں۔
یاس آمیز تھا۔ کہ تمام دُکھی روحیں اسے سُنکر ہائے ہائے کر رہی تھیں

ابلیس ابھی تاریک و مہیب قعرِ بیکراں میں اپنے بازوؤں کی پوری سکت کے ساتھ منڈلاتا ہوا اسے سُن رہا تھا۔

یہ سوز بھرا گیت بھی
نغمۂ محبت تھا۔
لیکن دونوں روحیں جنھوں نے اِسے الاپا۔
نامرادی۔ یاس و حرماں کی تصویریں تھیں۔

ماخوذ

کوئل

میں نے رات کے پُرسکون لمحات میں کوئل کی کوک سُنی اور میری دکھی ہوئی
روح نے یہ آنسو صفحۂ قرطاس پر منجمد کر دیئے

"پگلی کوئل کا ہے کوک سُنا"

اے کوئل! تجھے قسم ہے اپنے محبوب کی
"کوکو" کا نغمۂ فراق نہ الاپ
تیرا یہ سوز و گداز سے بھرپور گیت
میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر رہا ہے۔

اے کوئل۔ پریم پجارن۔
تیری کوک۔ ماضی کے افسانوں کی یاد دلاتی ہے۔
اور یاد کی کسک دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔

اے کوئل تجھے قسم ہے اپنے محبوب کی۔

"تُو کوکو" کر کے۔ سہاگ کی سہانی راتوں کی یاد نہ دلا۔
تیری "کوک" سُنتے ہی میرے دل میں اِک ہوک سی اُٹھتی ہے۔
آنسو۔ آنکھ کے دریچے سے جھانکنے لگتے ہیں۔

اے کوئل! کتنی نادان ہے تُو
باوری! کبھی اپنے ساجن کو بھی
تیری طرح بدنام کرتے ہیں۔
قسم ہے تجھے محبوب کی ــــ سوز بھرے نغمے نہ الاپ
کہیں دل خون ہو کر نہ بہہ جائے۔

"مانجھی"

مانجھی! علی الصباح تم نے دھیرے سے کہا تھا۔
"ہم دونوں کشتی چلائیں گے اتھاہ ساگر میں"
"دُنیا کی اور کوئی روح باخبر نہ ہوگی۔ ہماری منزل سے کبھی بھی

اس بحرِ بے پایاں میں —— سفینہ کھیتے کھیتے
میں گاؤں گی منوہر گیت —— محبت کے
جو ناچیں گے سمندر کی سرکش لہروں کے ساتھ۔
یہ ہوں گے آزاد — الفاظ کی قید سے
ہماری کشتی ہوگی رواں —— تیز رَو لہروں کے سینے پر
مانجھی!
کیا آیا نہیں وہ لمحہ ابھی
کیا دنیا کے دھندے نہیں ختم ہوئے ابھی۔
شام کی سیاہی پھیل رہی ہے سُرعت سے سمندر کی لہروں پر

پُرکیف دُھندلکے میں جا رہے ہیں پنچھی
اپنے آشیانوں کی سمت ۔

مالک جانے
کب ٹوٹیں گی یہ زنجیریں ۔
اور کشتی ہماری ——— سورج کی آخری شعاع کی طرح
ہو جائے گی گم ——— رات کی تاریکیوں میں ۔

(ٹیگور)

اُداس پرندہ

ناآشنائے بہار — بیگانۂ سکوں
تنہا پرندہ — ماتم کناں ہے اپنی کھوئی ہوئی محبت پر
بیٹھا ہے — خزاں رسیدہ درخت کی شاخ پر
محوِ فغاں ہے — غمناک پرندہ — اپنی کھوئی ہوئی محبت پر
ناآشنائے بہار — بیگانۂ سکوں

تنہا پرندہ ....
جنگل پر چھایا ہے — افسردہ سکوت
بادِ خزاں کے تند جھونکے — بنا رہے ہیں اُداس ماحول کو
برما رہی ہے فضا کو
دُور سے آتی ہوئی پون چکی کی صدا
عالمِ بیچارگی میں
سکون ناآشنا طائر
گردشِ ایام کا مارا ہُوا
ماتم کناں ہے کھوئی ہوئی محبت پر

مجھے یاد نہ آ

اے دوست : مجھے تو یاد نہ آ

میری بیقراریوں میں - میری اضطرابیوں میں - اضافہ نہ کر

اے دوست ! مجھے تو یاد نہ آ

کتنا نادان ہوں

تجھے اپنا بنا کر بھی —— اپنا بنا نہ سکا

بھولنا چاہتا ہوں تجھے —— بھلا نہ سکا

للہ مجھے تڑپاؤ نہ —— للہ مجھے کلپاؤ نہ —— للہ مجھے ستاؤ نہ

بار بار مجھے یاد آؤ نہ

اے دوست مجھے تو یاد نہ آ۔

جب آکاش پر تارے نکلتے ہیں —— جب باغوں میں غنچے ہنستے ہیں۔

جب چاندگگن اور دھرتی پر نور برساتا ہے۔ جب پپیہا شور مچاتا ہے۔

ایسے میں تم یاد آتے ہو۔
اے دوست مجھے تو یاد نہ آ

جب ہر چیز پہ ——— لمبی راتیں چھا جاتی ہیں
جب ہر چیز پہ ——— سرد ہوائیں زور دکھاتی ہیں۔
ایسے میں تم یاد آتے ہو۔
من میں برہا کی آگ لگاتے ہو
اے دوست مجھے تو یاد نہ آ ———

ایک خط بھولنے والے کے نام

بھول گئے ...... دوست

اتنی جلدی۔ کیا اسی بات پر دوستی کا دعویٰ تھا۔ اس بھول جانے پر۔ اتنی جلدی فراموش کرنے پر

تمہیں یاد ہوگا ...... دوست ..... تم نے کیا کہا تھا۔

"میں نہیں بھولوں گا" ..... کیا وعدہ وفائی اسے کہتے ہیں۔

میری بات یاد ہوگی ...... شاید تمہیں — میں نے کہا تھا" لفظِ محبت عام الفاظ سے بہت زیادہ معانی رکھتا ہے .... ہم ...."

اور تم نے کہا تھا" نہیں ہرگز نہیں — ہم دوست ہیں بہترین دوست" بھول کر بھی یہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ" یہی کہا تھا نا تم نے — دوست۔

یاد کرو ان باتوں کو۔ میں نے تمہیں خط لکھے — لیکن — مجھے جواب سے نہ نوازا گیا۔ میرے دوست وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں خط کا جواب نہ دینے پر مجبور کرتی ہے۔ کیا دشواریاں ہیں جو تمہاری راہ میں حائل ہیں۔

کیا مجھے خط سے بھی محروم رکھا جائیگا۔ کب تک .....

میرے دوست ! تم نے فراموش کر دیا
ایک ہمدم کو ــــــ دوست کو
میرے دوست ۔ ایک اداسی چھائی ہے تمہارے بغیر ۔ میرے وطن کی فضاؤں
میں
لیکن ۔ تم ان تمام باتوں کو فراموش کئے بیٹھے ہو ؎
ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات یاد نہ تمکو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ مگر بھلا سکے

پردیسی ساجن سے

ساجن!

یہ تو خوشی ہے میری

تمہارا انتظار کرنا —— تمہاری راہ دیکھنا

ساجن!

میں سراپا انتظار ہو کر —— راہ دیکھتی ہوں تمہاری

اس شب براہ پر۔ جہاں سایہ تعاقب کرتا ہے روشنی کا

برکھا رت آتی ہے —— موسم گرما کے آغاز میں۔

ساجن!

پنچھی آتے ہیں —— تمہارا سندیش لئے

پیام دیتے ہیں۔ اور ہو جاتے ہیں اوجھل نظروں سے

ساجن!
صبح سے شام تک
طلوعِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک
میں راہ تکتی ہوں تمہاری
یہ سوچکر۔ اِک لمحہ ایسا بھی آئیگا۔
جب آئیں گے ساجن میرے

میں مسکراتی ہوں —— گیت گاتی ہوں
تمہاری یاد میں —— اکیلی بالکل اکیلی
لیکن کب آؤگے —— ساجن

(ٹیگور)

راجہ اور بھکاری

ساجن !

تم دیارِ حسن کے شہنشاہ ہو

اور

میں پریم نگری کا اِک بھکاری

ساجن !

تمہارے ایوانِ عشرت کے مینار آکاش کی لاانتہا وسعتوں کو چوم رہے ہیں

اور

میں تمناؤں کے ایک ننھے سے ریت گھروندے کو برباد کر چکا ہوں

ساجن !

تم پریم کے ساگر سے کب کے پار اُتر چکے ہو۔

اور

میری کشتی جیون لہروں پر ہر لمحہ ہچکولے کھا رہی ہے۔

ساجن ! تمہارے ایوانِ محبت میں ہر شب چراغاں ہوتا ہے۔

اور

میری جھونپڑی میں ہر طرف ظلمات ہی ظلمات تیرگی ہی تیرگی ہے۔
ساجن! تمہارے ایوان سے محبت پاش۔ کیف بار۔ مدھ بھرے نغمے
فضاؤں میں تھرکتے ہیں۔

اور

میری جھونپڑی سے اک مدھم سی مجروح آواز سنائی دیتی ہے
جیسے کوئی دکھی روح شدت غم سے سسکیاں لے رہی ہو
ساجن! کتنا فرق ہے۔
اک راجہ اور بھکاری میں

وہ رات..........!

جب آبگینۂ دل کسی کی صہبائے اُلفت سے معمور ہو تو کیفِ حیات
حاصل ہوتا ہے

لیکن جب یہ ساغر ہی ٹوٹ جائے تو ....
جب کلیاں ہی مُرجھا جائیں تو پھولوں کی آرزو کیسی ——
زندگی بھر میں شاید ایک ہی رات ......
جس دن وہ آئے تھے —— لیکن وہ رات پھر نہیں آئیگی۔
ہر روز سورج مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہو گا
گرمی کے بعد سردی —— سردی کے بعد گرمی
خزاں کے بعد بہار —— بہار کے بعد خزاں
کلیاں مسکرائیں گی —— پھول کھلیں گے —— اور مُرجھائیں گے۔
بلبل ان کے غم میں آہ و فغاں کرے گی
خزاں اپنے دامن میں بربادیاں لیکر آئے گی
گلشن کی پتی پتی شاخ سے مُرجھا کر جُدا ہو جائے گی

لیکن وصال کی وہ رات پھر نہیں آئے گی
بہار کی مہکی ہوئی رات تھی۔ چاند آسمان پر نور برسا رہا تھا۔
میرے پہلو میں میرا چاند ضیا بار تھا۔
میری خورشیدہ جلوہ ریز تھی۔
شباب آلود فضا میں حسن کی تابشیں تھیں۔
جب میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔
تو آکاش پر ستاروں نے سرگوشیاں کرنی شروع کر دیں۔
دل کے معبد میں سکون کا دیوتا۔
مسرّت و شادمانی سے مُسکرا رہا تھا۔

آہ! وہ رات
اسکو بیتے کتنی لمبی راتیں گذر چکی ہیں۔
کیا وہ رات پھر نصیب نہ ہوگی
آہ! وہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے۔ کیا وہ کیف زا گھڑیاں پھر ہمیں آغوش میں نہ لیں گی
دلِ حزیں اس کی یاد میں بیقرار ہے۔
زندگی۔ آنسوؤں کے لیے وقف ہو چکی ہے۔

آمدِ یار

میرے دل کی ملکۂ خورشید
بصد ناز و ادا آئی
نسیمِ صبح کی طرح
جب سحر کا آتش نوا مغنی بجا رہا تھا رباب
ایسے میں آئی
جلو میں جلووں کی تابشیں لیئے ہوئے۔
کنول ایسے نینن میں
چھلک رہی تھی شراب جوانی
اس کے گھنیرے سیاہ بال لہرا رہے تھے
سانپوں کی طرح۔ بادِ مشکبو میں
اُسکے انار کی کلیوں ایسے ہونٹوں پر
تبسم رقصاں تھا۔
آرزوئیں بیدار ہوگئیں — ان کو دیکھکر

پوری ہوگئیں — شیریں خوابوں کی تعبیریں
کھِل گئیں تمناؤں کی نورس کلیاں
دیکھ کر اُن کے جلووں کی تابشیں

نالۂ دل

بیت گیا ہے دن دکھ بھرا

رات بھی آئی ستانے

خوشی نصیب میں نہیں
غم ہے میری زندگی ——— پھر کیوں آنسو بہانے
ساغرِ حیات سے اک قطرہ گرا
غم کا اک لمحہ کم ہوا

جل رہا ہے زندگی کا چراغ
تند ہوائیں موت کی
کیوں؟ آئی نہیں بجھانے — مالک جانے

کھلے ہیں زندگی کے در بھی
پڑا ہے متاعِ زیست ——— کاش آجائے کوئی اسے چرانے
من میں اک ہوک سی اُٹھی ——— یاد آئے پچھلے زمانے
تیرے بغیر میری زندگی ——— جیسے اُجڑے ویرانے

٭٭٭

یہ آنکھیں

من موہن - تمہاری آنکھوں میں کئی رس بھرے گیت بھرے ہیں -
مجھے اجازت دے — میں ان گیتوں میں کھو کر ایک مدھر گیت بن جاؤں۔

من موہن تمہاری آنکھیں
شراب وکیف کے دو اتھاہ ساگر ہیں
مجھے اُن سے جی بھر کے بادۂ الفت پینے دے
تاکہ خمار محبت سے مخمور رہوں
من موہن — تمہاری آنکھیں
پریم ساگر کے دو رس بھرے کنول ہیں -
مجھے اجازت دے کہ میں بھنورا بنکر ان سے پریم رس چوس لوں -
من موہن تمہاری آنکھیں -
پریم مندر کے دو روشن جھروکے ہیں -
جن سے پریم کی روشنی چھن چھن کر آتی ہے -
میرے من موہن تمہیں سوگند ہے ان نشیلی آنکھوں کی -
ان نینوں کو جھپک کر دنیا کو تہ و بالا نہ کر

راہی

شام کا دُھندلکا چھا رہا ہے
ہر سمت
بام گردوں پر شفق کی سُرخیاں
رقصاں ہیں۔
اِک لااُبالی انداز ہیں
پرندے لوٹ رہے ہیں
اپنے اپنے آشیانوں کی طرف
فضا میں اِک سکوت ہے چھایا ہوا
اُجڑی ہوئی ہیں راہیں ساری
سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی۔
پگڈنڈی پہ
جا رہا ہے
دھیرے دھیرے
سر جھکائے ـــــ ایک راہی

اجنبی دیس کے باسی

موت کے دیس میں —— چل دی
تن تنہا۔ ننھی میری
لمحے بھولے نہیں ۱
وہ ابھی
کھیل چھوڑ کر
دوڑتی ہوئی
جب وہ آتی تھی
چوم لیتا تھا میں بیخود ہو کر
اس کے سنہرے بالوں کو
لپٹ جاتی تھی وہ
فرط محبت سے

اور ظالم موت

تو کتنی بیداد گر ہے۔
چھین لیتی ہے۔ اُنھیں
جن کو ہم پیار کرتے ہیں
مصروف ہیں کھیل میں ۔ ننھّے بچّے
اب بھی — لیکن — کوئی کھیل چھوڑ کر
لپک کر میری جانب آتا نہیں
وہ — جس کی دُور سے آتی ہوئی صدا
نغمہ سے زیادہ شیریں تھی
اب وہ صدا کبھی نہ آئے گی — آہ اجنبی دیس کے باسی

چاند

چاندنی راتوں میں۔ آوارہ چاند
اپنی سیمیں کشتی کو کھیتا ہے
ستاروں کی زبانی —— معلوم ہوا ہے۔
کہ وہ کسی مخفی خزانہ کی تلاش میں ہے۔
لیکن یہ نہیں
بلکہ وہ کرنوں کی دیوی کی جستجو میں
آسمانی ندی کے نورانی طوفان کی پروا نہ کرتے ہوئے
ہر چاندنی شب کو اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔
لیکن —— افسوس
صبح کے قریب
جب کرنوں کی دیوی
اپنے حُسنِ تاباں سے دنیا کو منور کرتی ہے۔
چاند کی بلوریں کشتی آسمان کے نیلگوں سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔

مُسافر

"مسافر! کیا تم جا رہے ہو۔"
ہاں!
اتنی جلدی۔
جب جانا ہی ہوا
تو پھر جلد اور دیر کا سوال کیا؟
تم جانو۔
میں تو دیر تک تمہاری راہ دیکھتا رہا۔
شُکریہ!
کاہے کا
تمہاری تکلیف کا
کیا جاؤ گے؟ —— ہاں!
سچ مچ
کیوں؟

مجبوری

یہ بندھن توڑے نہیں ٹوٹتے
لیکن اگر تم چاہو تو۔
نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں

تم جا کہاں رہے ہو ؟
جدھر تقدیر لے جائے۔
تقدیر!
ہاں!
خوب ۔ تم تقدیر کے تابع ہو ۔
بیشک
اور تقدیر تمہاری تابع کیوں نہیں ۔
ایسا ہو نہیں سکتا
ایسا ہو سکتا ہے
تمہاری بھول ہے۔
تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔

مسافر! کیوں روٹھ گئے ؟

نہیں ۔
اپنے دل سے پوچھو
پُوچھ لیا ۔
بدل گئے
کون ـــــ تم
تم یا میں
نہیں میں تو نہیں بدلا
اور میں بھی نہیں
غلط فہمی
کِس کی ؟
تمہاری

اگر مجھے خبر ہوتی
کس کی ؟
اس لمحہ کی
کسی کو بھی آئندہ کی خبر نہیں
اور اگر تم واقف ہوتے تو پھر کیا ہوتا ؟
میں محبت نہ بساتا دل میں

کس کی ؟ ——— تمہاری !

اب مجھ سے یہ دُکھ سہا نہیں جاتا

کیسا دُکھ —— ؟

یہی دُکھ

تو پھر نہ سہو۔

لیکن تمہیں کیا خبر —— مجھے یہ دُکھ سہنا ہی پڑیگا

عادی ہو جاؤ گے

اچھا !

ہاں !

پروانہ دیکھا ہے

کئی بار

شمع سے اسکو لگن ہے

جب شمع جلتی ہے

یہ اس پر فدا ہو جاتا ہے۔

دوست !

محبت میں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے

جُدائی ——

سب کو اپنوں سے

جُدا ہونا پڑتا ہے

بھونرے کو پھول سے

پھول کو عندلیب سے

چاند کو چکور سے

اور چکور کو چاند سے

مسافر!

ہاں !

جاتے وقت ایک التجا قبول کرو

کہو !

مجھے ان گورے گورے ہاتھوں کو چوم لینے دو۔

کیوں ؟

اس لیئے کہ تم جا رہے ہو

ارے یہ تم نے کیا کیا ؟

تمہیں چُوم لیا —— بیتاب ہو کر۔

پردیسی کو

پیارے دوست کو

پردیسی کو —— الوداع —— خدا حافظ

نغمۂ حیات

زندگی !
اِک گیت ہے
ابدی و سرمدی
کیف آگیں
ترنم ریز
زندگی !
اِک گیت ہے
مدھر گیت
مسحور کن
پھولوں کی مہک سے بھی زیادہ لطیف۔
مگر ــــ اک لمحہ آتا ہے ــــ ایسا
جب سراپا سوز بن جاتا ہے یہ
اسکا ترنم ہو جاتا ہے بے اثر

رسیلی تانیں — آنسوؤں آہوں میں بدل جاتی ہیں
بساطِ روح پر اضطراب پیہم طاری ہوجاتا ہے
اٹھتی ہیں دل میں غم و الم کی لہریں
روح اسیرِ غم ہوجاتی ہے
آہ۔
دوسرے لمحے کچھ بھی نہیں
زندگی کا منوہر گیت۔ بن جاتا ہے اک بھولا بسرا سپنا

"رومال"

ہمنشین ! مت چھین

یہ رُومال میری پارینہ داستانِ محبت کا اِک نمایاں باب ہے۔

تو اسے نہ چھین۔

یہ میری بیتابی ـــــ بیکلی میں اضافہ کریگا۔

ندیم ! تو صرف یہ پُوچھ

"تمہیں یہ کس نے نوازا"

یہ اِک خونچکاں داستاں ہے دوست ـــــ ایک المناک فسانہ

جب میرے لیئے دنیا جوان تھی

اُن دِنوں محبّت کا فسانہ دہرایا گیا تھا

یہ رومال اس بیتی ہوئی محبت کی یادگار ہے۔

عید کا دن تھا ـــــ یوم مسرّت تھا۔

یہ تحفہ اُس دن ـــ مجھے بارگہِ ناز سے عطا ہوا تھا

یہ بہت سے پوشیدہ رازوں کا رازداں ہے۔

لیکن کتنا وفادار ـــــ آج تک ایک حرف بھی زبان سے نہیں کہا۔
اس میں ہجر کی راتوں کی دلدوز آہوں کا طوفان ہے۔
اس میں جدائی کی بیتاب گھڑیوں کا سیلاب اشک ہے۔
اس میں رم جھم برسنے والے آنسوؤں کے بادل اور شرربار آہوں کی
بجلیاں خوابیدہ ہیں
ہاں ہمنشیں تو اسے نہ چھین۔
تو اسکے خون کبوترا ایسے سُرخ رنگ پر محو حیرت کیوں ہے
دل نے فراق کی کہانی
اشکوں کی زبانی سنائی۔
وہ اشک خوں اس میں جذب ہو چکے ہیں۔
اس لئے ہمنشیں ـــــ یہ طوفانِ برق و باراں میرے پاس ہی رہنے
دے۔
تو پوچھتا ہے ـــــ یہ چاک چاک کیوں ہے
تو یہ کیوں نہیں پوچھتا ـــــ میں دل شکستہ اور چاک گریباں کیوں
ہوں۔
یہ اور میں
میں اور یہ محرم ہو چکے ہیں ایک دوسرے کے
ہمنشیں! کتنا نادان ہے تو

کہتا ہے — یہ دریدہ اور چاک کیوں ہے ؟
کیا شدتِ غم سے پیرہن تار تار نہیں ہُوا کرتے
ہاں —— تو ہمنشیں
یہ یادگار ہے پہلی اور آخری محبت کی
اس لئے تو اسے نہ چھین

"محروم"

سکھی! پیتم آئے
اور...... میرے پہلو میں بیٹھ گئے
لیکن میں بدنصیب —— نیند سے نہ جاگی
صد افسوس —— میری نیند کتنی لعنت آمیز ہے۔

سکھی! پیتم آئے۔
جب رات بالکل خاموش تھی
ہاتھوں میں بربط لئے ہوئے
اور اس کے مدھر گیتوں سے میرے سپنے سُندر بن گئے

آہ یہ میری راتیں۔ ضائع ہو گئیں
میں پیتم کی دید سے محروم رہتی ہوں
جس کی سانس میری نیند کو چھوتی ہے۔

(ٹیگور)

سفر

میں نے خیال کیا تھا —— کہ میرا سفر قریب الاختتام ہے
میرے آگے راہ مسدود تھی۔
میرا زادِ راہ ختم ہو چکا تھا۔
اور خاموشی سے پناہ لینے کا وقت آ چکا تھا۔
لیکن —— اے مالک
مجھے اسکا احساس ہے
تمہاری مرضی ہر حال میں مقدم ہے
جب زبان پہلے الفاظ کو چھوڑ دیتی ہے
تو دل سے نئے نغمے پھوٹتے ہیں۔
اور جہاں پرانی شاہراہیں مٹ جاتی ہیں
وہاں نئی بستیاں بس جاتی ہیں
لیکن اے مالک!
یہ سب تیری مرضی اور طاقت سے ہوتا ہے۔

(ٹیگور)

"سمندر"

سمندر
کف آلودہ — شورش طلب
سمندر
خاموش ہے — ایسے
جس طرح ایک معصوم بچہ
محو ہو خواب میں۔

مدوجزر پیدا ہوا
لہریں اُٹھیں دھیرے دھیرے
ساحل آب آلودہ ہوا
موجیں لاانتہا وسعتوں میں کھو گئیں

سمندر سو گیا

ایسے
جس طرح اک آشفتہ مزاج نوجوان
تھک کر آوارہ گردی سے
لوٹ آیا ہو گھر
اور ملے سکون اُسے
نیند میں

نیلے نیلے آسمان پر
شمع آفتاب روشن ہوئی
تھرکنے لگا اسکا عکس
پانی میں

یکایک
خوابیدہ سمندر بیدار ہوا
گہری نیند سے
چونک اٹھے جیسے کوئی
میٹھی میٹھی نیند سے
ایک دہشت ناک

خواب دیکھ کر

سمندر میں
اک تلاطم بپا ہوا
آتش مزاج سمندر
کف آلودہ

لہروں میں مدوجزر پیدا ہوا
خاموش فتنے بیدار ہوئے
سمندر کے جاگنے پر

(ماخوذ فری مین)

تمنّا

میرے دلدار!
کاش میں تمہارے رہگذر کی خاک ہوتی
تاکہ جب تم گذرتے
تو میں بیتاب ہو کر
تمہارے قدموں سے لپٹ جاتی
اور اگر میرے نصیب یاوری کرتے
تو میں —
تیرے آستانے کی خاک کے ساتھ مل جاتی
تاکہ ہر روز
تمہارے کفِ پا کے بوسے لیتی۔

کَل

"یہ کل" ہی تھا...... جب ہم
اس "رومان پرور چاندنی" میں کھوئے ہوئے وسیع میدان میں جدا ہوئے
ہم جان گئے —— آنے والے لمحات "کا مطلب"۔
جب ہم نے "چاندنی" کی رونقوں کو لٹتے ہوئے دیکھا

یہ کل ہی کی بات ہے
جب ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے
جُدائی کے لمحات نے ہمیں درد و کرب کی "عظمت" سے روشناس کیا۔
اور سبق سکھایا
"محبت قربانی ہے —— محبت اک درد ہے"
اور اِن میں ابدی و دائمی وابستگی ہے
اس لئے مجبوب
ہماری محبت ناکام نہیں۔

چاند کی کرن

رات تیرہ و تار تھی

متبسم ستارے بھاری بھاری بادلوں کے پردے میں پنہاں تھے۔

گہری تاریکی ہر چہار سو مستولی تھی

اور وہ "چاند" جس کی مجھے جستجو تھی

تاریک ترین پردوں میں نہاں تھا

آسمان کی نیلمی بلند وسعتوں پر آویزاں پردہ کے گوشے سے

ایک لجاتی ہوئی کرن ہویدا ہوئی

ایک ثانیہ کے لئے ناچی

چار سو پھیلی ہوئی تاریکیوں پر چلا کی

ایک لمحہ کے لئے جھلملائی۔ اور غائب ہو گئی

اس طرح نرم و نازک بول
شیرینی میں ڈوبے ہوئے
ان کے —— جو پر خار راستوں پر محنت و مشقت کا بوجھ اُٹھائے
چل رہے ہیں —— دُکھی لمحوں کو ہلکا کر دیتے ہیں۔
اور اُن سے تاریک زمانوں کو منور ——

راکھ

وہ راکھ جو زمین پر بکھری ہوئی ہے۔
میرے گذشتہ نشاط انگیز خوابوں کی ہے۔ جو چکنا چور ہو گئے۔
اور اگر ان میں خوابیدہ چنگاری شعلۂ جوالہ نہ بن گئی۔
تو اُن کی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی

میں نے ایک گڑھا کھودا اور اُس میں اپنی ہر ایک غم آگیں اور الم ریز امید کو دفن کر دیا۔
میں نے اپنی تمناؤں کے سایوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔
اس لئے ـــــ کہ وہ کہیں پھر میرے سینے میں تلاطم بپا نہ کر دیں۔

وہ راکھ جو زمین پر بکھری ہوئی ہے۔
میری زندگی اور محبت کے خستہ ٹکڑے ہیں۔
جنکو میں نے تعمیر کیا۔

اس باقی ماندہ "گوشت پوست" کیطرف جو درس عبرت دے رہا ہے۔
میں نگاہ کرتے جھجکتا ہوں۔

سامنے پھیلی ہوئی آرزوؤں کی راکھ جو ابھی تک سلگ رہی ہے۔
میرے سینے میں بے پناہ آگ کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے۔
لیکن زمانہ مجھے اپنی "برباد محبت" کو بھولنے میں مدد دیگا۔
پیشتر اسکے کہ زندگی کے سانس ٹوٹ جائیں۔

تصریحِ محبّت

اگر میں تیری محبت کا ایک دفعہ اظہار کردوں
تو پھر سینے پر کوئی بوجھ نہ رہے۔
اور اپنی روحانی کشمکش سے آزاد ہو جاؤں
لیکن الفاظ۔ اس تصریح کے لئے —— مبہم اور بے معنی سے ہیں۔
اس لئے میں ابتدا نہیں کرتا۔

ہر بار جب میں اُن رنگین خوابوں اور حسین خیالوں کو جو ایک محبوب کی خدمت میں پیش کرنے چاہئیں
ایک منوہر گیت کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔
تو میری روح لرز جاتی ہے۔ میری آواز کانپ اُٹھتی ہے۔
اور پھر اس خوشگوار کام کو کل پر ڈال دیتا ہوں۔۔

تمہاری محبت ایک شیریں سادگی ہے

اس سے بڑھ کر کوئی بھی چیز پاکیزہ اور نازک نہیں
پھر اس کی تصریح کس لئے،
محبت وہ پاک جذبہ ہے ۔ جو اظہار سے بے نیاز ہے ۔

دُکھی جوانی

سوہا کا خط کمار کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ سماج! آہ اسکے قوانین کس قدر سخت اور ہمہ گیر ہیں۔ اُن سے چھٹکارا کب اور کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر سوہا بیسوا کی لڑکی ہے۔ تو پھر کیا وہ ہر طرح پاکیزہ و منزّہ تو ہے۔ اُسکی خطا صرف یہی ہے کہ بیسوا کی لڑکی کہلاتی ہے۔ اُس کی ماں کی دوشیزگی اور عصمت و عفت ایسی گراں بہا شے کو بھی کسی مرد ہی نے لُوٹا۔ دوشیزگی کے پھول آبرو کے موتی کو اپنی بہیمانہ نفسانی خواہشات کی چٹان سے کچلکر چُور چُور کر دیا ہوگا۔ اُسوقت اس سنگدل سماج نے اس مرد کے لئے کیا سزا تجویز کی ہوگی۔ کچھ بھی نہیں!

پیارے کمار

میرے من مندر کے دیوتا۔ مذہب کے پُجاری۔ سماج کے نام لیوا۔ پریم بھکارن کو من مندر کے دیوتا کی پوجا نہیں کرنے دیتے۔ آہ! میں اسکے لئے مُوردِ الزام نہیں۔ میں ٹھردوش ہوں۔ میرے اور آپ کے درمیان سماج کی ایک وسیع۔ بے پایاں خلیج حائل ہے، جسے پھاندنا آسان تھا لیکن اب مشکل کر دیا گیا ہے میں آپ کی ہوں لیکن آپ

میرے نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں ؟ ——— شاہی مندر کے "پنڈت جی"
آپکو اس راز سے آگاہ کردیں گے ——— نادمِ مرگ آپکی
سوہا

———

گمار ایک دن شاہی مندر میں پوجا کے لئے گیا۔ مندر کی نقرئی گھنٹیوں سے مدھ بھری رسیلی تانیں فضا میں مچل رہی تھیں۔ پجاری اپنے سروں کو عقیدت سے دیوتا کے حضور میں جھکائے بھجن گا رہے تھے۔ اُن کے ہم آہنگ اور میٹھے میٹھے بھجنوں سے مندر کی محدود فضا سُرود سے معمور تھی۔

سوہا جوانی کی ترنگوں میں ڈوب کر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر دیوتا کے حضور میں بھجن گا رہی تھی۔ اس کی حسین روح نغمہ کی مسحور کن سروں میں گھل مل کر کسی ایسے عالم میں جا چکی تھی جس کی اُسے خود بھی خبر نہ تھی۔ وہ خود مجسّم دیوی تھی دیکھنے والوں کے سر خود بخود اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ اُس نے ابھی زندگی کی سولہ بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ اُسکے چمپئی رخساروں پر کاکل پیچاں زہری ناگوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ گلاب کی پتیوں ایسے نرم و نازک ہونٹوں پر گلابی راگ مرتعش تھے۔ مدھ بھری آنکھوں سے امرت رس کے دھارے بہہ رہے تھے۔ کمار نے اُسے دیکھا۔ اور من مندر کی دیوی بنا لیا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں دلوں کے لطیف راز ایک دوسرے پر آشکار ہو گئے۔ اِن نگاہوں میں ایک راز پنہاں تھا۔ "رازِ محبت"۔ جو صرف دل کی زبان سے عیاں ہو سکتا ہے پوجا دھیرے دھیرے ختم ہو گئی۔ نغمات فضا میں ایک تھرتھری پیدا کر کے خاموش ہو گئے۔ اور دیوی

کے پجاری بھی ایک ایک کر کے مندر سے چلے گئے۔ سب سے آخر میں سوہا بھی شاخ سنبل کی طرح لچکتی ہوئی آئی۔ کمار کی نگاہِ شوق اس کے ہر نقشِ قدم پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ ٹھٹکی۔ دزدیدہ نگاہوں سے کمار کی جانب دیکھا۔ اس کی میگوں آنکھوں میں شگوفوں کا تبسم جھلک رہا تھا اور پھر خراماں خراماں چلدی۔ لیکن کمار ابھی تک مندر کے صحن میں بت بنا کھڑا تھا۔

"کمار! یہ کیسے کھڑے ہو۔"

کسی نے اُسے چونکا دیا۔

کمار نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مندر کے پنڈت جی اُسے بلا رہے تھے۔ اِسے دیکھکر کمار نے جلدی سے نمسکار کیا۔

"بیٹا! تم مغموم کیوں دکھائی دیتے ہو۔ کیا کوئی تکلیف ہے؟"

"نہیں پنڈت جی۔"

"اچھا بیٹا اگر تم مجھے" ——— "پنڈت جی مجھے معلوم ہے۔" شودیال نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بابوجی" سوہا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سنکر پنڈت جی کے چہرے پر رنج وغم کی ایک لہر چھا گئی۔ شو۔

"تم ذرا ——— وہ یہ سمجھ کر کہ پنڈت کمار کو عدم موجودگی میں سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہاں سے چلدیا ——— بیٹا ذرا میرے کمرہ تک چلو۔ میں تم کو

کمرہ میں پہنچکر یوں گویا ہوئے۔ "کمار تم نے اس لڑکی کو کب دیکھا تھا؟"

"کیوں پنڈت جی کیا بات ہے۔" کمار نے دریافت کیا

"پہلے میری بات کا جواب دو"۔

"میں نے اِس سے پہلے اُس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا لیکن یہ تو بتائیے کہ اس میں کیا بُرائی ہے"۔

"نہیں میرا یہ مطلب نہیں"۔

"تو پھر آپ کیوں ——"

"بیٹا یہ ایک راز ہے"۔ آہ۔ وہ سماج کے قابل نہیں تم قسم کھاؤ۔ کہ اب اُسے دوبارہ دیکھنے کی کوشش تک نہ کروگے

کمار خاموش رہا۔

کمار کی زندگی میں یہ اولین دن تھا۔ کہ اس کے دل نے اک کسک۔ اِک خلش محسوس کی۔ وہ سوچنے لگا۔ پُجاری کے سینہ میں کیا راز مدفن ہے جسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے ہے۔ قدرت نے شوبھا کو اپنے فیاض ہاتھوں سے بنا کر اُس کے حُسن کو رشک کے قابل بنا دیا ہے۔ وہ زمین پر لطافت و رعنائی کی دیوی کا رُوپ دھارن کر کے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن پنڈت جی نے اُسے سماج سے خارج کر دیا ہے۔ میں اُسے اپنے من مندر کی دیوی بنا کر اُس کی پوجا کرنی چاہتا ہوں لیکن "پنڈت جی اور سماج" اسے ریت کے گھروندے کی طرح ڈھا رہے ہیں

دن —— شام میں تبدیل ہو گیا اور شام تاریک رات میں بدل گئی۔

اُسے چین و قرار نہ تھا۔ دل کی بیکراں وسعتوں میں ایک خیال تھا" سوہا کا"
رات بیقراری میں بسر کی صبح تڑکے ہی اپنے من مندر کی دیوی کے درشنوں کے لئے مندر میں پہنچ گیا۔ سوہا بھی بصد ناز آئی۔ آج اُس نے ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اور ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے گلاب کی پتی اپنے سبز رنگ کے غلاف سے نکلتی ہو۔ کمار نے اپنی نگاہوں سے پیام محبت دیا سوہا نے بھی حسین پلکیں اُٹھائیں۔ اس کی ستارہ ایسی آنکھیں کمار سے دوچار ہوئیں کیوپڈ نے دونوں کے دل تیر محبت سے زخمی کر دیئے۔ کمار نے دھیمی سی آواز میں کہا ——
"نمستے"—— سوہا نے جواب دیا۔
"میں آپ سے —— کمار نے حوصلہ کرتے ہوئے کہا۔
"خاموش —— لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں"
"نہیں —— ہم اُن سے دُور ہیں"
"لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا۔ تو ——
"تو کیا ہوگا ——
بدنامی —— اس کے بعد دونوں دیوتا کے حضور میں سر بسجود ہو گئے۔ پنڈت جی نے پھر آج اکٹھے دیکھا۔ تو ٹھنڈی سانس بھری۔ وقت پہاڑی ندی ایسی تیزی سے گذرتا جا رہا تھا۔ کمار اور سوہا دو قالب و یکجان ہو چکے تھے محبت کے دیوتا نے ان کے دلوں کو پریم کی ڈور سے باندھ دیا تھا۔ اب وہ چوری چوری چاندنی راتوں میں سیر کیا کرتے لیکن جب کبھی کمار نے سوہا کو شادی کے بارے میں کہا

وہ خاموش ہوگئی

ایک دن کُمار کالج سے واپس آیا تو اُسنے دیکھا۔ کہ اُسکے پتا کے کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے تھے۔ اُسکو دیکھتے ہی کمار کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ خدا ہی خیر کرے۔ معاملہ تو بے ڈھب سا نظر آتا ہے۔ کمار نے ابھی کتابیں بھی میز پہ بمشکل رکھی ہوں گی۔ کہ اُس کے پتا کی گرجتی ہوئی آواز سُنائی دی۔

"کُمار!" دوسرے ہی لمحہ وہ ملزم کی طرح اپنے پتا کے سامنے کھڑا تھا۔

"تمہیں شرم تو نہیں آتی"۔ "کس بات کی ؟ آپ کچھ بتائیں بھی۔

"پنڈت جی۔ ذرا اس طرف دیکھیئے نا۔ کیسا بھولا اور بیخبر بن رہا ہے۔ جیسے کچھ معلوم ہی نہیں۔ ننگ خاندان۔ بے شرم۔ چُلو بھر پانی میں ڈوب مر" اور جو کچھ کمار کے پتا کے مُنہ میں آیا کہہ ڈالا۔ جب اُن کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو پنڈت جی نے کہا۔ "ابھی بچّہ ہے۔ ناسمجھ ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا"

"خیر پنڈت جی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کمار کی شادی اُس لڑکی سے ہر گز نہیں ہوسکتی۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

ایک۔ دو تین دن ——— حتیٰ کہ ایک ہفتہ گذر گیا۔ لیکن سوہا کی اسے کوئی خبر نہ تھی۔ اور نہ ہی اُسکا خط موصول ہوا تھا۔ سوہا کے بغیر اسکو ایک لمحہ قرار نصیب نہ تھا۔ اس کے دل میں وہ آگ لگ چکی تھی جس کا بُجھنا اب ناممکن

تھا۔ محبّت کے متعلق لوگ کہتے ہیں میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے ممکن ہے ٹھیک ہو۔ لیکن اس کے دل و جگر میں ایک جلن سی ہو رہی تھی جیسے ان پر کسی نے دہکتے ہوئے انگارے رکھدیئے ہوں۔ اتوار کا دن تھا۔ دس بجے کے قریب وہ سوہا کے گھر گیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ وہ تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ ایک بڑھیا نے کہا "کرایہ دار تو چلے گئے"۔

اُس دن دو بجے اُسے خط ملا۔ کہ دیوتا پریم بھکارن کو من مندر کے دیوتا کی پوجا نہیں کرنے دیتے۔ اس کی زندگی کا رُخ بدل گیا تھا۔ وہ بول اُٹھا۔ "سوہا۔ میں تمہاری پُوجا کرتا تھا۔ مجھے تم سے والہانہ محبت ہوگئی تھی لیکن سماج کے ٹھیکداروں کو ——— وہ دل برداشتہ ہو کر اُٹھا۔ اور مندر میں جا کر سوہا کا خط دکھایا۔

پنڈت جی حقّے کا کش لگاتے ہوئے بولے" لو سُنو۔ سوہا کی ماں ویشیا ہے ایک دن وہ اُس لڑکی کو میرے پاس لائی۔ اُسوقت اُسکی عمر سات سال کے قریب تھی۔ اور کہا۔ کہ وہ شامت اعمال سے ویشیا بننے پر مجبور ہوگئی لیکن اس لڑکی کی عمر کو باپ کی دنیا سے بچانا چاہتی ہے۔ دوران گفتگو میں وہ زار زار رو رہی تھی مجھے اس کی آہ وزاری پر بیحد رحم آیا۔ یہ بات بھی معقول تھی۔ اسلیئے میں نے سوہا کی سرپرستی قبول کرلی۔ اور اس کی رہائش اور تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ اُس کی ماں ہر ماہ سوہا کے اخراجات کے لیئے ایک معقول رقم بھیجتی رہی۔ اب سوہا کو میں نے اس کی ماں کے پاس بھیجدیا ہے۔

"آپ نے یہ ظلم کیا"۔

"نہیں نہیں کمار۔ جو کچھ کیا گیا ہے۔ تمہاری بہتری کے لئے کیا گیا ہے"۔

"میں اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا"۔

"تم اُسے کبھی نہ پا سکو گے۔ کیونکہ سوہا کی ماں ایک آباد گھرانے کو برباد نہیں کرنا چاہتی"۔ پنڈت جی نے کہا۔

لیکن آہ سماج ـــــ کو کیا معلوم کہ کمار کے دل کی دُنیا تو برباد ہو چکی تھی۔ زندگی اُسکے لئے اجیرن ہو گئی تھی۔ پنچھی کے بغیر پنجرہ کس کام۔ اور پنچھی اُڑ چکا تھا۔

سوہا ایک بیسوا کی لڑکی ہے۔ اور سماج کے قابل نہیں۔

آہ سماج۔

اندھا بھکاری

مادھو ــــ بھکاری تھا۔ اور بھکاری ہی نہیں بلکہ اندھا بھی۔

لیکن جنم سے نہیں۔ سبھی تو جنم سے اندھے نہیں ہوتے۔ اُس کی لیلا نیاری ہے۔ جسے چاہا ویسا بنا دیا۔ دم مارنے کی مجال کہاں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اندھا پن بد احتیاطی کا نتیجہ ہے۔ ٹھیک لیکن غریب کے ہاں احتیاط ہوتی ہی کہاں ہے ؟۔ بھیک مانگنا مادھو کا خاندانی پیشہ نہیں تھا۔ یہ بھی اُس کے کرموں کا پھل تھا۔ جو اُسے بھوگنا پڑا۔

جب تک بڑا بھائی زندہ رہا۔ اُسے بھیک مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جب وہ مرگیا۔ تو۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے ہر شخص کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنی پڑتی تھی۔ شاید بھگوان کی مرضی ایسی تھی۔

لیکن اُسے اتنا تو یاد تھا۔ کہ وہ اور لیلا وتی ریت کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتے تھے۔ اُس وقت اس کی بینائی بالکل ٹھیک تھی کھیل کے دوران میں آپس میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ تو بچاری لیلا وتی کو مادھو کی مار پیٹ بھی برداشت کرنا پڑتی

تھی۔ ایک دن اُسے بخار ہو گیا۔ لیلاوتی کئی بار بلانے کے لئے بھی آئی لیکن وہ کئی دنوں تک نہ جا سکا۔

مادھو چیچک کا شکار ہو چکا تھا۔

جب وہ تندرست ہو کر چارپائی سے اُٹھا۔ تو بینائی جا چکی تھی۔

اب لیلاوتی اُسے بُلانے کے لئے آتی۔ تو وہ کہتا۔

"لیلاوتی۔ میں نہیں کھیلوں گا۔"

"کیوں؟"

"مجھے سجھائی تو دیتا نہیں۔ میں کھیلوں گا کیسے؟"

"میں تمہیں تمام باتیں بتاؤں گی۔"

اُسکے بعد لیلاوتی مادھو کا ہاتھ پکڑ کر لیجاتی۔ "مادھو! یہ رامو کا گھر ہے۔"

"اچھا رامو کا گھر آ گیا۔ مادھو کہتا۔

جب نیم کا پیڑ آتا۔ تو لیلاوتی یہاں ٹھہر جاتی۔ پھر یہیں گڑیا کا بیاہ رچایا جاتا براتی بنتے۔ باجے بجتے۔ قہقہے بلند ہوتے۔

معصوم بچّوں کا بچپن کتنا شاندار تھا۔

لیکن اس مسرّت و ابتہاج میں مادھو کی روح دُکھی تھی۔ اُسکا ہمجولی راہو جب کھیل تماشے۔ پھول پھلواڑی کی باتیں کرتا۔ تو اُسکا زخمی دل کراہ اُٹھتا۔ ایک آہ نکلتی۔ اور بے بصر آنکھوں میں سے آنسو ٹپک کر خاک میں جذب ہو جاتے۔ بچپن ایک سہانے خواب کی طرح گذر گیا۔

مادھو نے شباب کی پرکیف وادیوں میں قدم رکھا لیکن غریب کے لئے جوانی بھی وبال جان ہوتی ہے۔ جوانی میں۔ جوانی کی رنگینیوں سے لطف اندوز نہ ہونا خود جوانی پر ظلم ہے۔

اس دنیا میں صرف اسقدر انقلاب آیا۔ کہ لیلا وتی کا بیاہ ہوگیا۔ اور وہ اپنے سسرال سدھاری۔ جب ہمسائے اس کی حالت زار پر ترس کھا کر کہتے۔ آہ اندھا ہونا کس قدر بدقسمتی ہے تو مادھو کے دل پر ایک ضرب کاری لگتی۔ وہ تمام دن مغموم سا رہتا۔

مادھو کا بڑا بھائی شیام جب اس کو یوں پژمردہ وافسردہ دیکھتا تو اسے تسلی دیتا۔

"ارے تو۔ فکر کیوں کرتا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک سرمایہ دار کا رفیع الشان محل تعمیر ہو رہا تھا۔ نیم عریاں۔ فاقہ کش۔ زرد رُو۔ انسان چیونٹیوں کی طرح اس کی تعمیر میں تندھی سے مصروف تھے۔ "خواجۂ بلند بام" کے غلاموں میں سے ایک غلام شیام بھی تھا

وہ پانچویں منزل پر اینٹیں لے جا رہا تھا۔ کہ پاؤں پھسلا۔ اور کئی فٹ کی بلندی سے نیچے آگرا۔ ہڈی پسلی چکنا چور ہوگئی۔ دو تین سانسیں لیں اور پھر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہوگیا۔

شیام کی موت کوئی ان ہونی بات نہ تھی۔ سرمایہ داری کی بھینٹ پر۔ نوجوانوں کی جوانی۔ بچوں کا دلکش بچپن۔ عورتوں کا سہاگ سبھی کچھ قربان ہوجاتا ہے۔ چلتے چلتے چیونٹی پاؤں تلے آکر کچلی جاتی ہے اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ اس کی موت پر کون آنسو بہاتا ہے۔ غریب مزدور کی موت پر اسکے اپنوں کے سوا کون نوحہ خوانی کرتا ہے۔ اور سرمایہ داروں کو کیا ضرورت ہے کہ چنگ و رباب ، رقص و سرود کی پرکیف آوازوں میں غم آگیں نالے شامل کریں۔

غریب شیام کی موت سے جہاں اس کی بیوی کا سہاگ لُٹ گیا۔ بچے یتیم ہوگئے۔ وہاں مادھو پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اُس کی بے بصر آنکھوں میں آنسو صبح کے ستارے کی طرح لرز رہے تھے۔

جب تک بڑا بھائی زندہ رہا۔ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی۔ لیکن اب ——— بھتیجے اور بھاوج کی پرورش کا بوجھ بھی اس کے کندھوں پر آن پڑا۔

سڑک کے کنارے۔ ہر راہرو کے سامنے انتہائی عاجزانہ طور پر وہ بھیک کے لئے اپنا ہاتھ پھیلا دیتا۔ بعض راہگیر حسب توفیق پیسہ دیکر چلے جاتے۔ اور بعض سماج کو کوستے ہوئے گذر جاتے۔ لیکن مادھو کو دن بھر میں اتنے پیسے نہیں ملتے تھے۔ کہ وہ کنبہ کا پیٹ پال سکے۔ ہر کاروبار کساد بازاری کی وجہ سے مدھم سا ہوگیا تھا۔
شام کو وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا۔ آہستہ آہستہ گھر کی جانب آتا۔ دن بھر کی کمائی بھاوج کے سامنے رکھ دیتا۔ ایک دن مادھو کو سڑک پر جاتے ہوئے ایک شخص سے

پتہ لگا کہ ریل میں اندھوں کو کافی بھیک مل جاتی ہے۔

اُسنے یہ بات غور سے سُنی۔ اور پھر ایکدن وہ ٹرین میں بھیک مانگنے والوں میں شامل ہوگیا۔ وہ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں جاتا۔ اپنی بے بصری کا واسطہ دیتا۔ مسافروں کو جان و مال کی سلامتی کی دعائیں دیتا۔ مسافروں کا دل مسافت میں رحم سے معمور ہوتا ہے۔ مادھو کو اتنے پیسے ہو جاتے تھے کہ کنبہ دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکے۔

دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ سرد ہوا سائیں سائیں کرکے چل رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی ترشح ہو رہی تھی۔ بھیانک دُھند میں کبھی کبھی بجلی چمک اُٹھتی تھی مادھو گاڑی میں مسافروں کو "بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں" کہکر اُن کے جذبات ترحم کو اُبھار رہا تھا۔ آج اسے بہت کم پیسے ملے تھے۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے میں صرف ایک اسٹیشن باقی رہ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اسقدر تو پیسے ملجائیں جن سے کنبہ کا پیٹ بھر سکے۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ اسٹیشن آرہا تھا۔ وہ جلدی سے ایک ڈبے سے اُتر کر دوسرے ڈبے میں جانے لگا۔ یہ اُسکا ہر روز کا معمول تھا۔ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے نے اسے پٹڑی پر گرا دیا۔ گاڑی کے ہزارہا من بوجھ کے تلے آگیا۔ پہیہ عین چھاتی پر پھر گیا۔ خون کی ندی بہہ گئی۔ چند سیکنڈ میں بے جان جسم خون میں لت پت ہوگیا۔

گردشِ ایام کے ظلم کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور جیون کی زنجیر کی کڑی

بھی لُوٹ گئی تھی۔

جب قلی مادھو کی لاش اُٹھا کر ہسپتال کی طرف لیجا رہے تھے تو ایک بابو کہہ رہا تھا۔
"سالے ـــــ مر کر بھی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں" دور ایک تاریک گھر میں مادھو کی بھابھی اپنے اندھے دیور کی جان کی سلامتی کے لئے دیوتاؤں سے پرارتھنا کر رہی تھی لیکن سبھی دعائیں تو قبول نہیں ہو جاتیں۔

نرگس

جھیل کی دھیمی دھیمی لہریں کناروں کے قدم چوم چوم کر لوٹ جاتی تھیں
بکھری ہوئی چاندنی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جل پریاں رقصاں ہوں۔
دُور بلند قامت درختوں کے لمبے لمبے ناچتے سائے ایسے نظر آتے تھے
جیسے دیو لمبے لمبے ڈگ بھرتے جا رہے ہوں۔
نہ جانے میں کیوں کھویا جاتا ہوں؟
ایسے دلفریب نظاروں میں۔ اک سُرور کیف آگیں مجھ پہ طاری ہو جاتا ہے۔
میں گیت گنگنانے لگا۔ شاید اسکا مطلب کچھ ایسا ہی تھا۔

"یہ نہ کہنا نہ ہست
تمناؤں۔ امیدوں کے شیریں لمحات بیت گئے
جب تک زندگی ہے۔ محبت تیری رہے گی۔
میرے دل میں۔
یہ نغمے الاپے گا تیرے حُسن و عشق کے"

میرا ساتھی نجم چونک اُٹھا۔

"خورشید! کس کی محبت کے نغمے الاپے گا دل تمہارا"
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نزہت کے۔"
"لیکن میں کبھی حُسن و عشق کے قصّے نہیں دہراؤں گا۔"
"کیوں؟"
"جب انہی نغموں نے جیون برباد کر دیا ہو۔"
"کیا تمہیں کسی سے محبت ہے۔" میں نے ذرا استعجاب سے کہا۔
"ہاں"۔۔۔ مجھے محبت ہے۔ نہیں۔ بلکہ تھی۔
"کس سے"۔۔۔۔۔۔۔۔"نرگس سے۔"
"کیوں۔ میں تو نرگس کا نام آج ہی سُن رہا ہوں۔" میں نے لفظ نرگس پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے خورشید۔" نجم نے جواب میں کہا۔
کسی زمانے میں یہ نام میرے لئے ناہید کے نغموں سے زیادہ شیریں تھا۔
یہ نام سُنکر میں کیف زاستیوں میں کھو جاتا تھا۔"
"اور اب؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا
"اب ۔۔۔ کوئی کشش۔ کوئی دلکشی نہیں۔
بلکہ اک درد۔ کسک۔ تڑپ۔ بیقراری ہے۔
چاند کی کشتی آسمانی ندی کی سیمابی لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ننھے ننھے ستاروں کا عکس جھیل میں پڑ رہا تھا۔

جیسے کنول کے سفید پھول مُسکرا رہے ہوں۔

خاموشی نے ہلکے ہلکے سروں میں کائنات کو مسحور کر دیا تھا

دُور سے اِک نغمۂ لرزاں سنائی دے رہا تھا۔ جیسے شاید پریم نگر کا کوئی دکھی پریمی بڑے سوز سے گا رہا تھا۔ تاکہ اس شعلۂ جوالہ سے ارد گرد کے ماحول کو بھی آتشیں بنا دے۔

سجنی — تجھ بن کون سُنے گا مورے من کا گیت

من — کا — گیت

میں نے نجم سے مخاطب ہو کر کہا "یہ نرگس کون تھی"۔

یہ المناک داستان ہے۔ خورشید تم اسے سننے کی تاب نہ لا سکو گے۔ شکستہ بربط کے تاروں میں اگر ارتعاش پیدا کیا گیا۔ تو اس میں سے وہ نغمہ نکلیگا۔ جو المناک ہوگا"۔

لیکن میں نے اصرار کیا۔

وہ یوں گویا ہوا۔

"میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا۔ وہ کون تھی۔ کس خاندان سے تھی۔

اپریل کی اِک خوشگوار شام تھی۔ ہر چیز میں امن کی روح بسی ہوئی تھی۔ دُنیاوی رنج و غم جو ہر لحہ ہم پر چھائے رہتے تھے۔ اسوقت نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ہوا کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سے ہلکے ہلکے سُروں میں گیت کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے اِک جذبۂ کشاں کشاں اس جانب لے جا رہا تھا۔

اِک حسینہ گا رہی تھی جس کا حسین مکھڑا چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔

اُسکا حُسن۔ اِک فردوسی جمال تھا۔
وہ خود اپنے ہی گانے سے مسحور ہو رہی تھی۔ ماحول پر اِک طلسم چھایا ہوا تھا۔
مجھے دیکھکر وہ لجا سی گئی۔ نغمہ کی لہریں ہوا میں ناچ رہی تھیں۔
سُرخ رخساروں پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی
لبوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی۔ جیسے کلیوں کا انداز تبسّم۔
سرشار نگاہوں سے شرابِ حُسن چھلکی۔
چار آنکھیں ملیں۔ اور جھک گئیں۔ دو دِلوں میں دھڑکن پیدا ہوئی۔
اُف وہ لمحے
ہاں خورشید! یقین کرنا۔ اُس دن مجھ میں اتنی طاقتِ گفتار کہاں سے آگئی۔
"دیوی! اِک مدھر گیت اور سُنا دو
راگنی کیا تھی۔ میری بیتاب روح کے لیے پیغام حیات تھی۔ میں نے اپنی روح اپنی جوانی۔ اپنے گیت نرگس کی نذر کر دیئے۔
اِسی جگہ ہم تاروں کی چھاؤں میں گیتوں کے جھولے میں پریم کے منوہر سپنے دیکھتے تھے۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں چاند کو گواہ بنا کر ہم نے قسم کھائی تھی کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ میرے دل پر ان راتوں کی کیف زا کیفیتیں نقش ہیں۔

ایک۔ دو۔ تین دن گذر گئے۔ "نرگس" نہ آئی۔ مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہوگئی

بالآخر چوتھے روز ۔ شام کو میری اُس سے ملاقات ہوئی
یہ میری آخری ملاقات تھی۔ ہاں آخری ۔
نرگس کو شادی کے بندھنوں میں جکڑا جا رہا تھا۔ اس کے گلاب کے شاداب پھول ایسے چہرے پر زردی چھا رہی تھی ۔ وہ پھول جو قبل از وقت مرجھا گیا ہو۔ نرگس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ جُدائی کا پیام اک شعلہ تھا۔ اُسنے میرے خرمن سکون کو جلا دیا۔
" تم جا رہی ہو ۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔"
" آہ اُس شرابی کا کیا بنے گا۔ جو تمہاری سرمست آنکھوں کے میخانے سے خُم کے خُم پیتا رہا ہو ۔ اب اک تلچھٹ کے لیئے ترسیگا۔
اُسکا جواب
اِک آہ سرد تھی ۔ دلدوز ۔ جگر شگاف
آہ ـــــ یہ سماج ۔ اور اس کے بندھن
نرگس کا حسین چہرہ ۔ ایک پل بھر کے لیئے میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔
ایسے جس طرح کوئی دھندلا خواب ہو۔
اتنا کہکر نجم بڑبڑانے لگا ۔
تمہارے عہد و پیمان ۔ پریم کے بندھن ۔ کانچ کی چوڑیوں سے بھی زیادہ نازک نکلے ۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری تمناؤں کے پھول کھلنے سے پیشتر مرجھا جائیں گے تو میں کبھی بھی ـــــ

تمام فضا پر اداسی۔ پژمردگی چھاگئی۔
چاند نے بھی اپنے چہرے کو ردائے ابر میں چھپالیا۔
میں نے نجم سے کہا۔" آؤ گھر چلیں ــــ مجھے وحشت سی ہو رہی ہے"
جب ہم گھر کی جانب لوٹ رہے تھے۔ تو ریڈیو پر کوئی گا رہا تھا۔
ے سوجا ــــ دُکھی ۔ جوانی سوجا۔
جھلمل جھلمل کرتے تارے ٭ دُور نظر سے پریتم پیارے
ہنسے کیوں قسمت کے مارے ٭ روتے روتے بے سُدھ ہوجا

سوجا ــــــ دُکھی جوانی ۔ سوجا
نجم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے اور خاک میں جذب ہوگئے۔

نیلا لفافہ

نیلے نیلے۔ پیلے پیلے۔ اودے، سُرخ و سفید سبھی رنگ کے کاغذ کے پُرزے ہوا میں ناچ رہے تھے۔ خورشید اُنھیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کاغذوں کو پھاڑتا جا رہا تھا۔ یکایک اس کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا لفافہ آیا۔ اور شاید چھوٹے سے بکس میں یہ آخری ہی کاغذ تھا۔ خورشید لفافہ کو دیکھ کر خیالات کی دنیا میں گم سا ہو گیا۔ ایسے جس طرح ننھا بچہ نیند کی دلکش وادی میں کھو جاتا ہے۔ اور پھر خود ہی چونک اُٹھا ''نرگس کا خط''

مانو ــــــ ایسے جس طرح کوئی شخص ڈراؤنا خواب دیکھکر بیدار ہو جائے۔

لفافہ میں چند حروف لکھے ہوئے تھے۔ خورشید نے اسے بغور پڑھا۔

''آج شام کو چائے میرے ہاں پیجئیگا۔ اُمید ہے کہ آپ میری التجا کو نہیں ٹھکرائیں گے۔ ''نرگس''

خط پڑھتے ہی اُسے آج سے چار سال پہلے کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ اور ہر واقعہ بڑی سرعت سے سینما کی متحرک تصاویر کی طرح ایک ایک کرکے نظر آنے لگا۔ آج سے چار سال قبل وہ ایم اے میں پڑھتا تھا۔ اِن دنوں نرگس بی، اے کی

طالبہ تھی۔ پھر اسے کالج کا وہ مباحثہ یاد آیا۔ جس کا موضوع تھا" کیا طلباء سیاسیات میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس میں اسکے علاوہ سوتی۔ چندر کانتا۔ سوہا۔ منمو ہن۔ راجکمار۔ اور رشید بھی تو مقررین کی صف میں تھے۔

لیکن جب وہ تقریر کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھا تھا۔ اس کی تقریر کیا تھی۔ ایک طوفان عظیم تھا۔ جو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ الفاظ نہیں شرارے تھے۔

اُسکے سینہ میں اِک آگ لگی تھی اور وہ اِس آگ کو سامعین کے دلوں میں منتقل کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات کے علاوہ شہر کے معززین بھی تقریر سُن رہے تھے۔ اُس کی آواز کا زیر و بم۔ حرکات و سکنات کی دلآویزی دلپذیر تھی۔

طالبات کے زمرہ میں نرگس سب سے پہلی قطار میں بیٹھی۔ نہایت غور سے خورشید کی تقریر سُن رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں اس کی لیاقت کی داد دے رہی تھی۔ کبھی کبھی دُز دیدہ نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ لیتی تھی اور وہ بھی تقریر کے دوران میں ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیتا تھا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ یہاں آکر ٹوٹ گیا ــــــــــــ

پھر اُسے وہ لمحہ یاد آیا۔ جب لائبریری میں کسی نے اس کے شانے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ اُسنے پلٹ کر دیکھا ـــــ نرگس۔

وہ لجا سی گئی۔ اس نے شرماتے ہوئے خورشید سے کہا تھا

"میں انگریزی میں کمزور ہوں۔ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے"۔
"میں ٹیوشن نہیں کیا کرتا"۔ یہ اسکا جواب تھا۔
اسے سنکر وہ کتنی افسردہ ہوگئی تھی۔
"اُسنے کہا تھا لیکن پڑھائی میں کوئی مشکل آئے تو میں حاضر ہوں"۔
"شکریہ"

اُن کی واقفیت کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ اُس کے دوسرے دن اُسے نرگس کا خط ملا تھا۔ اور یہ اسکا سب سے پہلا خط تھا مختصر سا۔ لیکن پُر از معانی۔

"آج شام کی چائے میرے ہاں پیجئے گا۔ اُمید ہے کہ آپ میری التجا نہیں ٹھکرائیں گے"۔ "نرگس"

خورشید نے دوبارہ اس خط کو پڑھا۔ اور پھر گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا۔

نرگس خورشید کی آرزوؤں کا مرکز تھی۔ اسکا ایمان تھی کہ محبت ہی تو کائنات کا سب سے قیمتی خزانہ ہے جب خورشید نے ایم اے (فلسفہ) پاس کرلیا۔ تو کالج میں فیسر ہوگیا۔ نرگس بھی بی، اے کرچکی تھی۔ چنانچہ وہ ایک دن دونوں ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے کے ہوگئے اور ان کے درمیان ایک نہ ٹوٹنے والا ریشم کی گانٹھ سے پیچیدہ اور شیشے سے زیادہ نازک رشتہ قائم ہوگیا۔
شادی کے دو تین سال تو نو خیز عشق کی غشی میں گذرے اور وہ ان لمحات کو افسردگی سے یاد کرنے لگا۔ جب خورشید کی زبان پہ نرگس اور نرگس کے لئے

خورشید سب کچھ تھا۔ اُسنے اپنے دوستوں سے مِلنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ اور چاہتا تھا
کہ ہر وقت نرگس ہی کے رُخِ نگارین سے تشنہ کام آنکھیں سیراب کرتا رہے اسکی
آنکھیں ہنوز تشنہ کام تھیں لیکن گذشتہ چند مہینوں سے قدرے شکر رنجی ہونی شروع
ہوگئی تھی۔ اور کبھی کبھی گھریلو جھگڑے گھر کی راحت اثر فضا کو مسموم کر دیتے تھے۔

اب خورشید کو بھی حیلے بہانے کی عادت ہوگئی تھی۔ اگر وہ سینما جاتا تو کہتا۔
کالج میں لیکچر تھا۔ دوستوں کے ساتھ گھنٹوں سویپ (SWEEP) کھیلی جاتی۔
تو یہ بہانہ معقول تھا کہ پروفیسروں کی میٹنگ تھی جس میں اس کی شمولیت ضروری
تھی لیکن نہ جانے اس دن معمولی سے معاملہ نے کیوں اتنا طول پکڑا اور بات بڑھتے
بڑھتے بڑھ گئی۔

اور بات بھی تو معمولی تھی۔ نرگس نے شام کے کھانے سے لیکر ۱۱ بجے تک
خورشید کی انتظار کی۔ اور بغیر کچھ کھائے پیئے جا کر لیٹ رہی۔ نیند تو کوسوں دُور
تھی۔ ماما نے بہتیرا کہا۔ کہ بی بی آپ تو کھانا کھالیں۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اس کے بعد
ماما اپنے گھر چلدی۔ نوکر کو بھی آج ہی شاید چھٹی کی ضرورت تھی۔

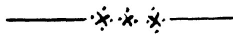
خورشید جب سینما سے واپس لوٹا۔ تو کھانا مانگا۔

"یہ تو ٹھنڈا ہے۔ اسے گرم کر دو۔"

"آج ٹھنڈا ہی کھالیجیئے گا۔"

اتنا سُنکر وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ اور جو مُنہ پر آیا۔ کہدیا۔ نرگس یہ ناروا سلوک

برداشت نہ کرسکی ۔ وقار نسوانی کو ٹھیس لگی ۔ اُس نے سوچا کہ وہ صبح میکے چلی جائیگی وہ اس گھر میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہ تھی ۔ اور صبح وہ میکے جا چکی تھی ۔



نرگس ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ وہ اپنی محبت کے ایام کو یاد کر رہی تھی ۔ جبکہ خورشید اسکا والہ و شیفتہ تھا اس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری تھی آج اُسے میکے آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا لیکن خورشید نے خود آکر اُس کی خبر لینا تو کجا اُسے خط تک لکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی تھی ۔

گذشتہ چار برس میں اور آج کے دن میں کتنا تفاوت تھا ۔ وہ اُٹھی اور مضطرب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگی ۔ پھر آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر ٹھٹکی ۔ لمبا قد ۔ بھرا ہوا سینہ ۔ نشیلی آنکھیں ۔ سر پر بکھرے ہوئے سیاہ بال جو صبح سے منت پذیر شانہ نہ ہوئے تھے ۔ سیاہ گھنی لمبی پلکیں ۔ وہ اپنا عکس دیکھ کر خود فریفتہ ہو گئی ۔ اور خود ہی بڑبڑا اُٹھی ۔

"کیا خورشید "تاج" کی زلف کا اسیر تو نہیں ہو گیا ۔ پچھلے ۔ دنوں سے نہیں نہیں ۔ مجھے خورشید پر ایسا گمان نہیں ہوسکتا ۔

میرے بغیر ان کو تکلیف ہوتی ہوگی ۔ وہ ہیں بھی لاپروا ۔ کمرے گرد و غبار سے اٹے پڑے ہوں گے ۔ فرنیچر پر گرد کی تہیں جمی ہونگی ۔

"ماں ! آج میں اپنے گھر جاؤں گی"

"ابھی تمکو آئے کون سے دن ہوئے ہیں۔ کچھ دن اور تو رہو۔
"نہیں میں کیسے زیادہ دن رہ سکتی ہوں۔ میرا ارادہ آج شام سے قبل جانے کا ہے۔"

نیلا لفافہ ابھی تک خورشید کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا میں نے نرگس پر بہت ہی ظلم کیا ہے میں دوستوں کے ساتھ سینما ؤں میں گھومتا رہا ہیں رات کے بارہ بارہ بجے تک تاش کھیلتا رہا۔ اور اس سے حیلہ سازیاں کرتا رہا ہیں آج شام نرگس کو منا کر لے آؤں گا۔

خورشید ابھی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے دبے پاؤں آکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خورشید نے پلٹ کر دیکھا۔ "نرگس"

نرگس کی نرگسیں آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ خورشید نرگس کے مرمریں و نازک ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ اور مجبور ہو کر دھیمی سی آواز میں کہنے لگا۔

"نرگس مجھے معاف کر دو۔"

"پہلے آپ مجھے معاف کر دیں۔"

خورشید کی باہیں نرگس کی صراحی دار گردن میں حمائل ہو چکی تھیں لیکن ہوا میں ابھی تک کاغذوں کے اودے۔ نیلے۔ پیلے۔ سرخ و سفید کاغذوں کے پرزے ناچ رہے تھے۔

زندگی کی دو تصویریں

یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے، جسے میں نے بچشم خود دیکھا اور پہروں تک موجودہ سماج کے نظام کے متعلق سوچتا رہا۔ آہ مفلس ہندوستان "تیرے سپوتوں کے لیئے تیری وسیع زمین دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

(ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو)

پہلی تصویر

"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب

"فرمایئے۔" (ذرا دھیمی آواز سے)

"ڈاکٹر صاحب دیکھئے نا۔ میرے کتے کو بخار ہوگیا ہے کل رات سے اُسنے بالکل کچھ کھایا پیا نہیں۔" اتنا کہکر ہندوستانی مس نے نوکر کو آواز دی۔ جو باہر کار کے پاس کھڑا تھا۔ اُسنے کتے کو گود میں اُٹھا لیا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ معائنہ کے کمرہ کیطرف لے گیا۔

یقین کیجئے گا۔ پیارے کتے کی جدائی میں مس صاحبہ بیکل و مضطرب ہوگئیں

لیکن ڈاکٹر صاحب کے یقین دلانے پر کہ ابھی واپس لوٹتا ہوں۔ وہ کمرے میں ٹھہرنے کے قابل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب لوٹے اور کہا۔

"اسے چیچک کا عارضہ ہے۔"

"چیچک"۔ مس صاحبہ پر بجلی ہی تو گر پڑی۔ بڑی رقت بھری آواز میں اور ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بچ جائے گا۔"

"کیوں نہیں" ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا۔

"لیکن اس کو انجکشن کرنا پڑیگا۔

"کوئی حرج کی بات تو نہیں"۔ مس صاحبہ نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ تو اس کے لئے آپ کو دس روپے ادا کرنے پڑیں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ روپوں کی فکر نہ کیجئے۔ خواہ پچاس خرچ ہو جائیں۔ لیکن اس کی جان بچ جائے۔ یہ کہکر مس صاحبہ نے منی بیگ میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ڈاکٹر کو دیدیا۔

دوسری تصویر

وٹرنری ہسپتال سے تھوڑی دور ٹریننگ کالج کے چوک کے قریب ایک بھکارن پر میری نظر پڑی مفلسی، بھوک اور پیاس کی تصویر۔ اس نے دریدہ اور کہنہ لباس پہنا تھا۔ جو اس کی ستر پوشی کے بھی ناقابل تھا۔ ہونٹوں پر بھوک کی وجہ سے پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کی گود میں ایک دبلا پتلا سا بچہ تھا۔ جو اس کی چھاتی سے

دودھ حاصل کرنے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اور دودھ نہ ملنے پر بلبلا اُٹھتا تھا۔

بھکارن ہر راہگیر کے آگے دست سوال دراز کرتی۔ "بابو ایک پیسہ مل جائے کل سے بھوکی ہوں"۔

لیکن ہر شخص اس کی حقیر سی آواز کو پائے استحقار سے ٹھکراتا ہوا جا رہا تھا۔

میری نظر کے سامنے زندگی کی دو تصویریں۔

غربت۔ بھوک۔ افلاس ——— عیش و عشرت بیفکری

یہ روح فرسا منظر دیکھ کر میں بڑا افسردہ خاطر ہوا۔ اور معاً مجھے حضرت اقبالؒ کا حکیمانہ قول یاد آیا۔

"اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔"

اُوشا

اُسکا نام "اوشا" تھا۔

وہ خوبصورت تھی۔ صبح بہاراں سے زیادہ۔ شاعر کے نازک خیالوں سے زیادہ دلکش۔ اس کی چال کبک کو بھی شرماتی تھی۔ آواز ناہید کے بربط سے زیادہ دلفریب اور سُریلی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں اُترنے والی چنچل اور مست آنکھوں میں محبت انگڑائیاں لیتی تھی

دھانی رنگ کی ساڑھی میں وہ ایسے معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بہار کی دیوی خود آسمان سے اُتر آئی ہو۔ میری اور اس کی ملاقات مالابار ہل۔ میں ہوئی۔

رات بھیگ رہی تھی۔ ہولکے پاکیزہ اور لطیف جھونکے کیف آگیں تھے۔ صاف اور شفاف آسمان کی نیلگوں سطح پر ستارے چھٹکے ہوئے تھے۔ ابدی مُسرتیں شراب بنکر برس رہی تھیں

میں نے اُسے دیکھا۔ اور دیکھتے ہی کہا "یہ وہی ہے۔ وہی۔" "سپنوں کی رانی" جسے میرا تصور اکثر چاندنی راتوں کی غمگین خلوتوں میں دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھی تھی۔

میں سامنے کی بینچ پہ آکر بیٹھ گیا "آپ بُرا تو نہیں منائیں گی" میں نے کہا۔
"نہیں ۔" یہ آواز مندر کی نقرئی گھنٹی کی طرح دلآویز تھی۔
یہ ابتدا تھی ہماری محبت کی۔
میری نظریں اس کی نظروں سے دو چار ہوئیں۔ آہ وہ لمحے۔
اُس نے پھر اک نگاہ غلط انداز ڈالی۔ میں جھینپ سا گیا۔
یہ محبت کا آغاز تھا۔
آہ! اسکا انجام کتنا جانکاہ ہوتا ہے۔ میں اس سے بے خبر تھا۔
ایک شام
اپریل کی ایک ناقابل فراموش شام کو اوشا اور میں باہم دونوں اکٹھے سیر کے لئے گئے۔ میں کس قدر مسرور تھا۔ اس کا اندازہ کون لگائے۔
جس طرح مضراب ساز کے تاروں پر نہیں ٹھہرتا۔ اسی طرح میرے قدم زمین پر وفورِ مسرت سے نہیں پڑتے تھے
بازار کے کونہ پر ایک لڑکی پھول بیچ رہی تھی۔
جب میں پھول لیکر آیا۔ وہ یوں گویا ہوئی "کیا آپ کو پھولوں سے محبت ہے"
"کون انھیں پیار نہیں کرتا" میں نے جواب دیا۔
"لیکن —— مجھے پھولوں سے محبت نہیں"
"کیوں ؟"
"پھولوں سے نہیں، بلکہ ان کے مُرجھانے سے۔ یہ بڑے بے مہر ہوتے ہیں

مردوں کی طرح۔" یہ کہکر وہ خاموش ہو گئی۔

اور میں سوچنے لگا۔ یہ ہے تو ٹھیک۔ واقعی پھول مرجھا بہت جلد جاتے ہیں لیکن مرد ——— اسپر میں نے سوچنا لاحاصل سمجھا۔

بجلی کی روشنی سمندر میں عکس ریز تھی "گیٹ وے انڈیا۔ کا طویل تر سایہ نظر آتا تھا۔ اس کی دائیں جانب "تاج محل" کی سر بفلک "بقعۂ نور" عمارت ایسے کھڑی تھی جیسے شہر کا جائزہ لے رہی ہو۔

سمندر کی لہریں اٹھتیں۔ سنگین دیواروں سے سر پٹک کر بحر بیکراں کی لا انتہا وسعتوں میں اپنے آپ کو کھو دیتی تھیں۔

دُور راج ہنس کی طرح ایک کشتی اپنے سپید بادبان پھیلائے سطح آب پر تیر رہی تھی اور اس سے پرے اندھیرے میں ایک برطانوی جہاز پر چند سائے متحرک نظر آرہے تھے "روشنی کے مینار" کی روشنی بجلی کی چشمک معلوم ہوتی تھی اور ہم دونوں پہلو بہ پہلو بیٹھے ان کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔

یکایک میں نے اوشا سے پوچھا "کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے۔"

"نہیں۔ کر رہی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اس خاموشی میں مسرت کی روح بسی ہوئی تھی۔ میری دنیائے محبت! ایک دلھن کے تصورات سے بھی زیادہ حسین تھی۔ میں چاہتا تھا۔ "وہ اور میں۔" "میں اور وہ۔" دونوں اسی طرح بیٹھے رہیں۔ یا یہ لمحے اس قدر طویل ہو جائیں کہ کبھی ختم ہی نہ ہوں۔

"اوہ۔ پھول۔ یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہے" یہ کہکر میں نے ایک پھول اوشا کے بالوں میں لگا دیا۔

"رات چھا رہی ہے" اوشا نے کہا۔ اب واپس چلنا چاہیئے۔ دیر ہو رہی ہے"

راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے بات چیت نہ کی۔

نہ جانے کیوں؟ میں تو یہی سوچتا رہا۔

"میں محبّت کی بازی پر جوانی کا داؤ لگا رہا ہوں۔ ہار ہوگی یا جیت۔۔۔ لیکن محبّت میں جیت بھی ہار۔ اور ہار۔ جیون کی بربادی"

اور وہ نہ جانے کیوں خاموش تھی۔ اسوقت چونک اٹھی۔ جب کنڈکٹر نے کہا "لال باغ"

پھر اک دلنواز مسکراہٹ سے الوداع کہہ کر گھر کی جانب تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی چل دی۔

جب دل میں کسی کا خیال بس جائے۔ تو انسان دیپک کی طرح جلتا رہتا ہے۔ پریمی کو اپنے پریتم کی سُندر صورت کے سوا اور کوئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی۔

میں "اوشا" کے خیال میں اک نغمہ دھیرے دھیرے گنگنا رہا تھا۔ اس کا مطلب شاید یہی تھا۔

سکھی! میں نے پیتم کو ڈھونڈھ لیا۔

جب وہ اپنی بنسری بجاتا ہے۔

تو سندرتا بھری دھرتی پر پریم چھا جاتا ہے ۔
پریم کے رنگ میں پریم کا رنگ ملا کر
آج ہم دونوں رقص کریں گے ۔اس دنیا کے ختم نہ ہونے تک
میرے من کے دیپک میں امرت دمک رہا ہے
اور میں پروانہ کی طرح جل جل کر ختم ہو جانا چاہتی ہوں ۔
کسی نے دبے پاؤں آکر میری آنکھیں بند کر دیں ۔
اور دلنشیں آواز میں کہا ۔
"نام بتا دیں —— تو آنکھیں کھولیں گے ۔
"میرے سپنے کی رانی" "اوشا"

زمانہ نام ہی ہے اک گردش کا ۔ وقت کا پہیہ ہر وقت تیزی سے گھومتا رہتا ہے ۔ آئے دن نئے نئے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ۔ خلاف امید جن کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا ۔

وقت نے پانسہ پلٹا ۔ اور مجھے اس "دیارِ شعر و حسن" سے چند ماہ کے لئے آنا پڑا اسی اثنا میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا ۔

لیکن ابھی دو ماہ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ اوشا نے خطوط کا جواب دینا بند کر دیا ۔

مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ "عورت کی محبت سمندر کی

طوفانی لہروں کی طرح ہے۔ جو سفینۂ حیات کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ اگر اوشا نے مجھ سے محبت نبھائی نہیں تھی۔ تو ——— تو کسی کو اپنا بنا کر چھوڑ دینا کیا صریح ظلم نہیں

ایک شام کا ذکر ہے۔ میں "چوپاٹی" پر گھوم رہا تھا حسینوں کے جمگھٹوں میں پیارے پیارے بچوں کے قہقہے بھی بلند ہو رہے تھے کہ معاً میرے کان میں اک آشنا آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ـ "وہ" تھی۔ اور اسکے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ اسکا خاوند ہے۔

اُس نے میری طرف دیکھا۔

نہ جانے کیوں۔ اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ تاکہ غم کو دُور کر دے۔ ہونٹوں پہ ہنسی۔ آنکھ میں آنسو۔ ایسے جس طرح صبح کے وقت کومل پھول کے لبوں پر ہنسی۔ آنکھوں میں آنسو۔

محبت اِک لڑکی کی روح کو ایک پھول کی طرح شگفتہ بھی کر سکتی ہے اور باد سُموم کے تند جھونکے کی طرح مُرجھا بھی دیتی ہے۔

دُور آسمان پر اِک ننھا سا ستارہ جھلملا رہا ہے۔ اور اس کی جھلملاتی روشنی میں اِک پیکر نظر آ رہا ہے۔

میں اُسے یاد کرتا ہوں۔ وہ مجھے بھول چکا ہے۔

مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ زمین۔ یہ آسمان۔ یہ ماحول اِک ساز ہے جس سے
اِک راگ نکلتا ہے۔ یاس آمیز غم آگیں۔ تقدیر نے پانسہ پھینکا۔ مجھے ہار آئی۔ لیکن
اس مسلسل غم جانکاہ کا کب وقت ختم ہو گا۔

زندگی کے سانس ہیں۔ ایسے جیسے بادِ خزاں کا طویل اور غم انگیز راگ!
آہ "محبّت کے فریب"۔

عورت کی فطرت

عورت کو سراپا نغمہ اور رنگین پھول سے تشبیہ دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت ایک

ڈسنے والی ناگن ہے۔ اور سراپا معمہ جس کے سمجھنے سے انسانی عقل قاصر ہے

شبیرا نے بیلوں کے لیئے چارہ کاٹتے ہوئے اپنے بوڑھے باپ شعبان سے کہا۔

"بابا! کل شام نشاہ، ربانی کے کھیت کیطرف سے آ رہی تھی میں نے اُسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ بے عزتی دیکھی نہیں جاتی۔ شریک جی بھر کے طعنے دیتے ہیں۔ سویرے الاؤ پر نورا یہی باتیں کر رہا تھا۔ میرے آنے پر تمام خاموش ہو گیئے لیکن میرے کان میں یہ بھنک پڑ گئی"۔

"بے عزتی کی زندگی سے تو موت اچھی۔ پیر جی نے بھی کہا تھا۔ کہ بے عزت آدمی میں ایمان نہیں ہوتا"۔

"ہوں" کہہ کر بوڑھے شعبان نے سرد آہ بھری۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ ـــــ آنے والے ہولناک لمحہ کا تصور کر رہا تھا۔

"بابا! میری تو یہ صلاح ہے کہ قصہ ہی پاک کر دیا جائے نہ رہے بانس نہ بجے

بنسری "

نشاہ !

شعبان کی لڑکی تھی۔ اور سات بھائیوں کی ایک بہن۔

دیہاتی حُسن کا مرقع۔ کانوں میں چاندی کے بندے۔

جب وہ سُرخ رنگ کی کرتی، سیاہ لہنگے پر پہنکر خراماں چلتی۔ تو ایک ایک قدم پر سو سو فتنے بیدار کرتی۔

نشاہ ـــ دوشیزگی کے اُس دَور میں تھی، جو ایک دوشیزہ کو سراپا تمنا بنا دیتا ہے۔ کہ اُسے کوئی جی بھر کے پیار کرے۔

وہ جوانی کے اُس دَور سے گذر رہی تھی۔ جہاں ایک چاہنے والے کی جستجو ہوتی ہے لیکن محبت کی ایک لغزش۔ عمر بھر کے لئے قعرِ مذلت میں گرا دیتی ہے......

ربانی گاؤں بھر میں بانکا سجیلا جوان تھا۔ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ قد۔ گٹھیلا جسم۔ کبڈی۔ رسہ کشی اور دیگر کھیلوں کا بہادر کھلاڑی۔ ہمتوں کا جوان علاقہ بھر کا مشہور چور (چوری کو جانگی معیوب نہیں سمجھتے) جب ریشم کے کنارے والی لنگی باندھ کر اور بالوں کو تازہ تازہ مکھن سے چُپڑ کر گلیوں میں نکلتا۔ تو گاؤں کی دوشیزائیں کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتی تھیں

نشاہ کو ربانی ـــ اور ربانی کو نشاہ سے محبت تھی۔

لیکن یہ محبت پاکیزہ نہ رہ سکی۔ اُن کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔

اور محبت معصیت میں بدل گئی۔

عشق اور مشک چھپائے کبھی چھپ نہیں سکتے۔ نشاہ اور ربانی کی اس محبت کا چرچا گاؤں والوں کی زبان پر تھا۔ اور ہر دیکھنے والی آنکھ یہ دیکھنے کے لیے سراپا انتظار تھی۔ کہ اس عشق کا انجام کیا ہوگا۔

رات تیرہ و تار تھی۔ گاؤں کی آبادی پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن کتوں کے بھونکنے کی مسلسل آواز اس سکوت شب کو تار تار کر رہی تھی۔ نشاہ کے گھر کے تمام افراد گہری نیند سو رہے تھے لیکن وہ بیدار تھی اور اس لمحہ کا انتظار کر رہی تھی جب ربانی آئے اور وہ اس کے ساتھ فرار ہو جائے۔ وہ اس گھر کو جہاں پیدا ہوئی اور پل کر جوان ہوئی ۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کے لیے تیار تھی کسی نے لاٹھی سے چھپر کو اوپر اٹھایا۔ اور ساتھ ہی کھانسنے کی آواز آئی نشاہ ننگے پاؤں اٹھی۔ اور آبگینۂ نام و ناموس کو چکنا چور کرتی ہوئی تاریکی میں گم ہو گئی۔

صبح جب گھر کے لوگ بیدار ہوئے تو نشاہ کی چارپائی کو خالی دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ چڑیا پنجرے سے اڑ چکی تھی۔

بوڑھے شعبان نے سر پیٹ لیا۔ اور نشاہ کے بھائیوں کے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔

شمیرا نے اپنی برادری کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ انتقام کے لئے مشورہ ہوا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں ہمتیں بیدار ہوئیں۔ غیرت جاگی۔ عزائم نے قدم بڑھائے ڈھول کی آواز نے گاؤں والوں کو ہوشیار کر دیا۔ ڈھول کی دھپ دھپ کے ساتھ ساتھ کتنے بھونک کر آنیوالے حشر خیز لمحہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔

دونوں طرف سے کڑیل نوجوان ہاتھوں میں لاٹھیاں لیکر نکلے۔ اور ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ لاٹھیاں سروں پر برس رہی تھیں۔ فریقین کے آدمی تیورا کر گر گئے اور بے سُدھ ہو گئے۔

تمام آبادی پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں۔ ہر متنفس متوحش۔ سات لاشیں ——— مالک تیری پناہ ———

کمالیہ کے تھانے میں چوکیدار ہانپتا ہوا پہنچا۔ اور تمام واقعہ ہیڈ محرر سے بے کم و کاست بیان کیا۔

آن کی آن میں سُرخ سُرخ صافے والے جائے وقوعہ پر آموجود ہوئے۔ نمبردار اور چوکیدار اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ لاشیں ہسپتال میں بھجوا دی گئیں۔ مرنے والوں کے نزعی بیان قلمبند کیئے گئے۔ فریقین کے کئی آدمی گرفتار ہوئے اور عدالتی کارروائی کی ابتدا شروع ہوئی۔

ساہیوال (منٹگمری) کی جیل میں اس خونیں ڈرامے کا ڈراپ سین ہو رہا تھا احاطۂ جیل کا ذرّہ ذرّہ اپنے دامن میں قیامت کا فتنہ لیئے ہوئے تھا۔ تختۂ دار نصب ہو چکا

اور پھانسی کا پھندا ایک نہیں۔ بلکہ نو بانکے سجیلے نوجوانوں کی گردنوں میں پڑنے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔

ان نوجوانوں کی زندگی۔ جوانی۔ کے پھول مسل کر خاک میں ملانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

جب ان کو تختۂ دار پر کھینچا گیا۔ تو۔ اس حادثۂ حزینہ کی یاد میں سرزمین منٹگمری کے باشندے خون کے آنسو بہا رہے تھے

لیکن نشاء اپنے حقیقی اور چچا زاد بھائیوں کی المناک موت سے بے پرواہ بے نیاز ہو کر اپنے آشنا کے ساتھ صدر بازار میں ریشمی کمربند خرید رہی تھی۔ لیکن اس کے تبسّم میں جہنم کے شرارے بھرے ہوئے تھے۔ اور دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے کہ یہ عورت ہے یا کوئی ناگن۔ شاید وہ نہ جانتے تھے۔ عورت کی فطرت کو۔

بلیدان

یہ افسانہ آج سے چند سال پیشتر مجھے ایک بوڑھے مسافر نے سنایا تھا۔ یہ اس کی آپ بیتی ہے۔

آپ اسے صحیح خیال کریں یا غلط۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن یہ کس قدر دردناک ہے۔ اسکو

پڑھکر اندازہ لگائیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ترشح ہو رہی تھی سرد ہوا کے جھونکے بدن میں کپکپاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ شام کا وقت ہو۔ بادل گھرے ہوں۔ ایسے میں کون بغیر کسی پابندی کے کام کرے چنانچہ میں نے کنواں چلانا چھوڑ دیا۔ اور بیلوں کی جوڑی کو کھول کر چھپر کے نیچے لاکر باندھ دیا اور آگ جلاکر تاپنے لگا۔ دُور کھیتوں میں ایک بوڑھا شخص جس نے اپنی زندگی کی ساٹھ بہاریں دیکھی ہوں گی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے نبرد آزمائی کرتا ہوا آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا ہوا۔ دُور سے آگ دیکھکر میری جانب بڑھا آرہا تھا میرے قریب آکر "السلام علیکم" کہا اور بیٹھکر آگ تاپنے لگا۔

"بڑے میاں کہاں سے آرہے ہو"۔ میں نے پوچھا۔

"خدا کی سرزمین سے"۔ اسکا یہ جواب اگرچہ عجیب وغریب تھا لیکن میں پوچھ ہی بیٹھا کہ "آپ کہاں جارہے ہیں"۔

"جہاں کا آب و دانہ قسمت میں لکھا ہو گا۔"

میں اپنے دونوں سوالوں کے جواب سُنکر جکڑا سا گیا۔ چند منٹ تک وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ میں نے حقہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کش لگانے لگا۔ اور یہ بات میرے ذہن سے اُتر گئی تھی کہ کس طرح دوست کا تذکرہ زیر بحث آیا تھا۔ میں نے کہا تھا۔ کہ "دنیا میں کوئی سچا دوست ہی نہیں"۔ اور اُس نے کہا تھا "دنیا سے سچے دوست کا وجود عنقا نہیں"۔

پھر اُس نے مجھے یہ آپ بیتی سنائی۔

"نجم اور اشرف دو دوست تھے۔ نہایت ہی گہرے دوست۔ اکٹھا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایکدوسرے پر جان فدا کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کو ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی لیکن۔ عورت، ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے ان دونوں دوستوں میں ہمیشہ کے لئے جدائی پیدا ہو گئی۔

گاؤں کے نمبردار کی لڑکی جس کا نام "نازو" تھا۔ اسکا باعث ہوئی۔ لڑکی کیا تھی حُسن وجمال کی نادر زریں مورتی۔ اسکے پتلے پتلے گلابی ہونٹ۔ مینائی گردن، لمبے لمبے سیاہ گھنگریالے بال۔ سفید رنگت کشمیر کے سیب ایسے گال۔ بادام کی سی آنکھیں تھیں جن میں شوخی ٹپکتی تھی۔ دیہاتی حُسن سادگی ہی میں ہوتا ہے۔ اُسکو غازہ اور پوڈر کی ضرورت نہیں۔ دونوں اس کی زلف کے شکار تھے۔ اور وہ جب بھی پانی بھرنے کنوئیں پر جاتی تو کنکھیوں سے ان کو اکٹھے جاتے دیکھتی۔ دونوں اسکو چاہتے تھے مگر ایک دوسرے سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ مبادا آپس

میں شکر رنجی پیدا نہ ہو جائے

نجم دیکھ رہا تھا۔ کہ اشرف اب اس سے ملنے سے گریز کرتا ہے۔ ان کی وہ لمبی ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں لیکن وہ اسکا سبب نہ جان سکا۔

بہار کی چاندنی رات تھی۔ دریائے نور ٹھاٹھیں مار رہا تھا ہوا میں بھینی بھینی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے نکل کر کسی جذبہ کے تحت کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جسے وہ کبھی بھول نہ سکا۔

"نازو اور اشرف بیٹھے محبت کی باتیں کر رہے تھے۔

"نازو تم بھول جاؤ۔ نجم کو۔ میری ہو نا۔ ہاں تم کہہ دو۔ صرف ایک بار" نازو نے سر کو رضامندی کے طور پر ہلا دیا۔ نجم اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور وہاں سے دل برداشتہ ہو کر واپس آ گیا

نجم دوسرے دن اشرف کے مکان پر پہنچا۔ آواز دی"۔ اشرف۔ اشرف۔"

"کون ہے؟" اشرف نے اندر سے پوچھا۔

"اشرف میں نجم ہوں۔ ذرا باہر آنا۔ تم سے ایک ضروری کام ہے"

اشرف باہر آیا۔

"اچھا دوست الوداع" اشرف یہ سنکر چونک پڑا

"ہیں خیر تو ہے"؟

"میں جا رہا ہوں اشرف"۔

"کہاں؟"

"جہاں قسمت لے جائے۔

"نہیں۔ نہیں دوست ایسا ہرگز نہ کرنا۔ نجم مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گے۔

"نہیں تم اکیلے نہیں ہو گے۔ اشرف تمہیں اس کا نعم البدل مل جائے گا لیکن اشرف میں تمہاری خوشیوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا"۔ یہ کہکر نجم چلا گیا۔

دوسرے دن گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر نجم کے چلے جانیکا چرچا تھا۔ لوگ اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھے۔ وہ اشرف سے بھی پوچھتے تھے لیکن وہ کیا بتاتا۔ نجم کے چلے جانے کے بعد اشرف چند دن تو اداس رہا لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ انسان خوشیوں میں گذشتہ غموں کو بھول جاتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد اشرف اور نازو کی شادی ہوگئی۔ اور اسے بھولے سے بھی یاد نہ کیا۔ انھوں نے اپنی دنیا کی بنیاد رکھ لی لیکن نجم کا جیون برباد ہو گیا۔ اس کی آشاؤں پر سیاہ بادل چھا گئے۔

بوڑھے نے اتنا کہہ کر سرد آہ بھری اور کھانستے ہوئے کہا"۔ نجم کی زندگی برباد ہوگئی۔ اسنے اسکے بعد شادی نہ کی۔ ماحول میں پژمردگی کی روح بسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ وہ بدنصیب کون تھا۔ اگر نہیں تو سنو"۔ وہ میں ہوں جس نے دوست کی خوشی پر اپنے آپ کا بلیدان دیدیا۔ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ تمہیں

اس راز سے آگاہ کر رہا ہوں شائد اب تو تمہیں یقین ہو جائیگا۔ کہ کم از کم دنیا میں سچّی محبّت کا وجود عنقا نہیں۔"

بُوڑھے کی آنکھوں سے چند قطرے زمین پر گر کر خاک میں مل گئے۔

باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ تند ہوا کے جھونکے دررانہ وار گھسے آ رہے تھے چنانچہ ان سے بچنے کے لیئے بوڑھا ایک کونے میں دبک کر سو گیا۔

وطن کا پجاری

موہن بی، اے پاس کر چکا تھا۔ اور ایم، اے میں پڑھ رہا تھا بڑا بھائی بنک میں منیجر تھا۔ اور اس سے چھوٹا ابھی اسکول کا طالب علم تھا۔ اگرچہ والدین بہت امیر نہ تھے لیکن گذارہ بخوبی چل رہا تھا اسوجہ سے کوئی فکر و غم نہ تھا۔ ناز و نعم میں پرورش ہوئی تھی۔ عادات سنوارنے میں ماں کا بہت حصّہ تھا۔ موہن ہنس مکھ نوجوان تھا۔ چہرہ پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ باپ کی بہت سی اُمیدیں اُس سے وابستہ تھیں۔ باپ خیال کرتا تھا کہ موہن ایم، اے پاس کرنیکے بعد اگر ڈپٹی کمشنر نہیں تو ڈپٹی کلکٹر ضرور بن جائے گا لیکن کسے معلوم تھا۔ وہ تخیلاتی محلات جسے وہ عرصہ سے تعمیر کر رہا تھا۔ یکایک ریت کے گھروندے کیطرح آن کی آن میں مسمار ہو جائیں گے۔ وہ تمام سُہانے خواب جنھیں وہ مدت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خواب ہی رہجائیں گے۔ اُن کی تعبیر کبھی سچّی نہ ہوگی

مادرِ وطن کو آزادی دلانے کے لئے جد و جہد شروع ہوگئی تھی۔ آزادی وطن کے دیوانے شمعِ حرّیت پر پروانہ وار نثار ہونے کے لئے چلے آرہے تھے۔ ایک لگن

تھی، جو سب کو لگی تھی۔ اِک آگ تھی، جو ہر دل میں سلگ رہی تھی۔ تمام قومی سپاہی امن اور عدم تشدد کے اصولوں پر کاربند ہو کر جیلوں کو آباد کر رہے تھے۔ "مادرِ وطن کو آزاد کراؤ"۔ "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ عوام الناس کے کانوں سے گذر کر کالج کے نوجوانوں تک پہنچ گیا تھا موہن نے اپنا نام رضاکاروں میں درج کرالیا۔ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دستخط کرنے سے مستقبل تاریک ہو گیا۔ اندھیری رات کی طرح باپ کی درخشاں امیدوں پر کاجل ایسی سیاہ گھٹائیں چھا گئیں۔ پروفیسر نے بہتیرا سمجھایا۔ دوستوں نے لاکھ منتیں سماجتیں کیں۔ کہ وہ اس ارادہ سے باز آئے لیکن سب بے اثر۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن جس نے بھی سنا۔ کہا "مستقبل تباہ کر لیا"

"دُنیاوی جاہ و جلال" اور "فرض" میں کشمکش ہو رہی تھی۔

کیا یہ ہمارا فرض نہیں؟ کہ ہم مادرِ وطن کو آزاد کرائیں۔

اُسے یہ حقیقت معلوم تھی "جب تک مُلک آزاد نہ ہوگا ہم سر بلند نہیں کر سکتے"۔

موہن جب پرچار کر کے گھر آیا تو ماں کو منتظر پایا۔

"کیوں خیر تھی موہن"

"ہاں"

"آج دیر سے آئے ہو۔ میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے"۔ اتنا کہہ کر ماں نے کھانا لا کر موہن کے آگے رکھ دیا لیکن اس نے ابھی ایک دو نوالے ہی کھائے ہوں گے کہ نتھو گھبرایا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔

"بابوجی ! بابوجی"

"آخر کچھ کہو بھی" موہن نے پوچھا۔

"آپ کو پتاجی بلا رہے ہیں"

"کہو کھانا کھا کر آیا"

"نہیں۔ ابھی ابھی بُلایا ہے۔ داروغہ جی سپاہیوں کو ساتھ لیکر مکان کے باہر کھڑے ہیں۔ "تلاشی تلاشی" کا کہہ رہے ہیں"

"تلاشی" یہ سُنکر موہن کی ماں چونک اُٹھی۔ موہن نے ماں کیطرف دیکھا۔ اور ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا۔ اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہتی لیکن موہن نے اُس کی نظروں سے معلوم کرلیا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہے۔

"موہن اگر تم ———"

اور موہن باپ کے کمرہ کی طرف چلا گیا۔

تلاشی میں داروغہ جی کے ہاتھ تو کچھ نہ لگا لیکن موہن کی گرفتاری کا وارنٹ بھی تھا۔ اس نے ماں کے قدموں پر سر رکھ کر رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ ماں نے موہن کو مخاطب کرکے کہا "اپنے قول کا پاس کرنا۔ ایشور تمہارا نگہبان"۔ یہ کہکر اُسے چھاتی سے لگا یا۔ اور پھر آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ باپ نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"آخر الزام کیا ہے؟"

"مجھے خود معلوم نہیں لیکن آزادی طلب کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔ پرسوں میں نے ایک تقریر کی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم کھدّر پہنیں"

باہر سے داروغہ جی نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا "جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے"
موہن پرنام کرکے کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور داروغہ صاحب نے اُسے اپنی معیت میں لے لیا لیکن کمرہ میں بوڑھا باپ جُدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اور بیہوش ہوگیا۔

موہن کو ڈیڑھ سال کے لئے پابند سلاسل کر دیا۔ رات کیوقت کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا۔ نہ جانے باپ کا کیا حال ہوگا۔ ماں پر کیا گذرتی ہوگی۔ خاندان کی امیدیں مجھ سے وابستہ تھیں لیکن دل سے ایک آواز نکلتی تھی
"فرض کی ادائیگی سب سے مقدم ہے۔
جس طرح زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آسکتا۔ اسی طرح اب میں اس عہد سے نہیں پھر سکتا۔ جو میں نے بھرے مجمع میں کیا تھا لیکن ابھی قید ہوئے دو ہی ماہ گذرے تھے۔ کہ گھر سے خط آیا۔ کہ باپ کی حالت خطرناک ہے۔ اُسے خواہش ہوئی۔ کاش چند لمحوں کے لئے اُسے آزادی مل جائے تو پنچھی کی طرح اڑکر باپ کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے قصوروں کی معافی مانگ لے۔ لیکن ممکن نہیں تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا خاموش دھارا رواں ہوگیا۔

ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا۔ اُسے گھر سے کوئی خط نہیں آیا تھا۔

وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ ملک و قوم کے لئے میں اپنے آپ کو قربان کر سکتا ہوں لیکن گھر کے دیگر افراد کو تکلیف دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اچانک ہی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اسکا بڑا بھائی سوہن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ موہن گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے پرنام کر کے پوچھا "گھر کا کیا حال ہے؟"

"تمہارے بغیر تو گھر سونا ہو گیا ہے۔"

"پتا جی" ـــــ "آہ ـ وہ ـ تو" یہ کہتے ہوئے سوہن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ موہن بھی دلدوز ہچکیاں لے رہا تھا۔

"آپ کا کیسے آنا ہوا؟"

"میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔"

"ماں کا کیا حال ہے؟" ـــــ "اسی لئے تو میں آیا ہوں۔ وہ کوئی دم کی مہمان ہے۔ اور زبان پر ہر وقت تمہارا ہی نام ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔ جلد کہو" موہن نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"اس پر دستخط کر دو" ـــــ "معافی نامہ"

"چھی چھی چھی۔ بھیا مجھ سے ایسا نہ ہو سکے گا ماں سُنے گی کہ میں معافی مانگ کر آیا ہوں۔ تو وہ شائد میرا مُنہ تک دیکھنا گوارا نہ کرے۔ ماں نے رخصت ہوتے وقت کہا تھا۔" اپنے قول کا پاس کرنا۔ پتا کی موت کی خبر تک نہ بھجوائی۔ شائد میرے قدم میں لغزش نہ آجائے۔ بھیا! جاؤ۔ ماتا کو میرا پرنام کہنا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چرر۔ چرر۔ چرر۔ وارڈر نے آہنی دروازہ بند کر دیا۔ اور موہن کو تنہائیوں میں غرق چھوڑ دیا۔

ماں کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ پھر داروغہ اور سپاہی نظر آئے ماں نے چلتے وقت جو نصیحت کی تھی۔ اُسکے الفاظ ابھی تک کانوں میں گونج رہے تھے۔

قیدی

"قیدی نمبر ۱۳"
گنتی کرنے والے وارڈر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"حاضر!"
قیدی نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

یہ نووارد قیدی چند ہی دنوں سے میرے ساتھ کی کوٹھری میں آیا تھا۔
یہ نوجوان تھا لیکن اسے جوان کہنا جوانی کی توہین تھی۔
پژمردہ زرد چہرہ۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی
لیکن کل تو اس نے اسقدر مدھم آواز میں جواب نہیں دیا ـــــ میں نے دل ہی دل میں کہا

وارڈر نے میری کوٹھری کے قریب آکر قیدی نمبر ۱۴ پکارا

"حاضر!"
اتنا کہہ کر میں نے اسے آواز دی۔ "جمعدار"
"کیوں۔ کیا ہے؟" اس نے اکڑ کے جواب دیا۔

"کیا قیدی نمبر ۱۳ بیمار ہے؟"

"مجھے خبر نہیں۔ اُس سے پوچھ لو۔"

"میں خیالات کی دنیا میں گم ہوگیا۔" یہ ہے کون؟ کیسے قید ہوا؟ "

میں اس سے صبح پوچھ لوں گا۔ اگر کوئی موقعہ ملا تو ——— میں اسے ڈھارس

دُوں گا۔

"نادان! جب تم زندان میں ہو۔ دُکھ درد کو چھوڑ دو۔ یہ تو ماحول کو اور بھی

اُداس بنا دیتے ہیں۔ پھر اداس ہونے سے کیا فائدہ؟"

پھر مجھے معاً اس قیدی کا خیال آیا۔ جو ہر وقت مسرور رہتا ہے۔

چکی پیستے وقت کتنے مزے سے گاتا ہے۔ آج تک کسی نے بھی اُسے اداس

نہیں دیکھا۔ دیہاتی سا گنوار ہے۔ لیکن دُکھ سُکھ کے فلسفے کو خوب جانتا ہے ———

——— میں تو خود دُکھ سُکھ کے فلسفے کو بھول جاتا ہوں۔

اور میرا ہمسایہ قیدی تو شاید ———

یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

اسے خوش قسمتی سمجھئیے یا اتفاق پر محمول کیجیے۔ یہ آپکو اختیار ہے۔ کہ میری

اور سعادت (قیدی نمبر ۱۳ کا نام) کی مشقت چکی خانہ میں لگی۔

میں نے اس سے پوچھا "تم کل بیمار تھے؟"

"نہیں۔"

"میں نے تو یہی سمجھا۔"

ایک طرف برق انداز کے کوڑے کی تڑاق پڑاق کے ساتھ چیخوں کی آواز آرہی تھی میں نے بھی ڈر کے مارے چکی کو تیز کر دیا۔ اور وہ جلدی جلدی آٹا اکٹھا کرنے لگا۔

جب وہ جابر انسان چلا گیا۔ تو میں سعادت سے یوں گویا ہوا۔

"تم اداس کیوں رہتے ہو؟"

"اور یہاں خوش ہی کون رہ سکتا ہے۔

"تکلیف اتنی اذیت دہ نہیں جتنا کہ اسکا تصور۔" میں نے جواب میں کہا۔

"اور جب ہر طرف تکلیف ہی تکلیف ہو۔ تو پھر۔

میں نے کہا "سعادت میری جانب دیکھو مجھے پابند سلاسل ہوئے دو برس ہو چکے ہیں۔ اور میں نے ابھی ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵+ گویا ایک ہزار سات سو چھبیس دن یہاں گذارنے ہیں لیکن میں تمہاری طرح اگر آنسو بہاؤں تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وبال جان ہو جائے۔ اور تمہیں کتنی سزا ہوئی ہے۔

"دو سال۔"

"واہ یہ دو سال تو آنکھ جھپکتے ہی گذر جائیں گے۔"

میں نے ایک ادھیڑ عمر کے قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے عمر قید کی سزا ہوئی ہے لیکن دیکھو کس قدر ہشاش بشاش ہے۔

اور سچ پوچھو۔ تو رنج و غم انسان خود پیدا کرتا ہے۔
اُسے اِک خیال ڈھارس بندھا رہا ہے۔ اور وہ ہے آزادی کا خیال۔
لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ زندگی کا چراغ زندان میں ہی گل ہو جائیگا۔ تو

جب تمام قیدی تھوڑی دیر سُستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تو میں نے کہا
"سعادت تمہیں سزا کیسے ہوئی"۔
"لو سُنو"۔ یہ کہتے ہوئے وہ گویا ہوا۔
"میں کپڑے کی مل میں مزدور تھا۔ یہ ایک بڑی بھاری مل ہے۔ کوئی ایک ہزار کے قریب مزدور کام کرتے ہیں۔
نائٹ شفٹ بند ہونے کی وجہ سے دو صد کے قریب مزدور بیکار ہو رہے تھے۔ بہت سے اشخاص کو نوٹس مل چکے تھے۔ اور باقی مزدوروں کی کشتیٔ حیات زندگی اور موت کے سنگھم پر ہچکولے کھا رہی تھی۔
مزدوروں کا ایک وفد مالک کے پاس ملنے بھی گیا۔ لیکن اسے باریابی نصیب نہ ہو سکی ———
عُریاں تن۔ فاقہ کش۔ انسانوں کے اس گروہ کو کوٹھی کے احاطہ کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا گیا۔
مزدور کہتے تھے۔ مزدوری کم کر دو۔ مزدوروں کے بچّوں کو روٹی کے ٹکڑے سے محروم نہ کرو۔ لیکن بے سود۔

کارخانہ میں ہڑتال ہوگئی ۔ جلوس پُرامن طریقہ پر بازاروں میں سے گذرتا ہُوا۔ امیروں کی سڑک کی طرف جا رہا تھا۔

مزدور روٹی مانگنے جا رہے تھے لیکن انھیں کیا مِلا ——

سرمایہ داروں کے محافظ ۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے، گِدھوں کی طرح اردگرد منڈلا رہے تھے۔

شام کے وقت شہر کے باہر پبلک گراؤنڈ میں مزدوروں کی ہمدردی میں ایک اجتماع عظیم ہوا میں بھی مزدور تھا میں نے مزدوروں کی حمایت میں تقریر کی اور کہا۔

"غریبوں کے دبانے سے غریبی دب نہیں سکتی ——"

ہجوم کو مشتعل کرنے کے الزام میں مجھ پر مقدمہ چلا۔ اور دو سال کی قید ہوگئی"

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دوست" میں نے کہا۔

سعادت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا" مجھے اس قید کی پرواہ نہیں لیکن آہ —— دو پاک روحیں —— میری جُدائی میں تڑپ تڑپ کر اس جہان سے رخصت ہوگئیں جب میں حوالات میں تھا۔

ننّھا "نجم" ایک ہفتہ کے اندر گھُل گھُل کر مر گیا۔ یہ کہتے ہوئے سعادت کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ پھر وہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔

"اچھا ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ اس کی معصوم روح قفس خاکی سے پرواز کرگئی"

"مزدور کا بچہ مزدور ہی ہوتا ہے۔"
اسکے بعد مجھے "رضیہ" کا کوئی خط نہیں ملا لیکن کل جیلر نے بلا کر یہ خط دیا۔ اتنا کہکر اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ پر رکھدیا۔

مقام
تاریخ

میرے سرتاج
اپنی رضیہ کا الوداعی سلام قبول کرو۔
زندگی کا چراغ۔ چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہا ہے۔ اب یہ بجھنے کو قریب ہے۔ بالکل قریب۔ صرف چند لمحوں کے بعد آپ کی رضیہ آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ مجھے ایک غم ہی جو تا حشر رہے گا۔ کہ دمِ آخر — میری جان آپ کے قدموں پر نہ نکلی لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ جس وقت یہ خط آپ کو ملیگا۔ آپ کی رضیہ ابدی نیند سو رہی ہوگی۔"

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

"نجم" کی معصوم روح مجھے لینے کے لئے آگئی ہے۔ الوداع
آپ کی
"رضیہ"

خط پڑھکر میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگا دیں۔ اور سعادت بھی بچّوں کی طرح رونے لگا۔

اب بھی جب کبھی میں ۱۲ کا ہندسہ پڑھتا ہوں۔ تو مجھے قیدی نمبر ۱۲ کی کی داستان یاد آجاتی ہے۔ اور روح پر ایک ناقابل بیان اُداسی چھا جاتی ہے۔

اچھوت کا گناہ

ہجور۔ بہت گریب ہوں۔ پھانوں مر جاؤں گا۔ نوکری سے نہ ہٹاؤ۔ آپ
کے پیّاں پڑتا ہوں۔"

اتنی التجاؤں۔ اتنی فریاد اور آہ و زاری کے بعد چھدو خاکروب نے
ایک عقیدت مند پُجاری کی طرح جو نہایت خلوص اور شردھا سے دیوتا کے حضور
میں سر بسجود ہو جاتا ہے۔ سینٹری انسپکٹر کے پاؤں پر اپنا سر رکھ دیا۔

یہ التجا تھی چھدو کی۔ جسے مذہب کے نام نہاد پُجاریوں اور سرمایہ داروں
کے ایجنٹوں نے اچھوت قرار دیکر ذلیل و خوار کر دیا تھا۔ اُس کی ذہنیت اسقدر پست
کر دی گئی تھی۔ کہ وہ انسان ہو کر انسان کو سجدہ کرتا تھا۔

"ہاں ہاں۔ سُن لی ہے۔ تمہاری بات۔" سینٹری انسپکٹر نے گرجتے ہوئے کہا

"ہجور آپ ہی تو سب کچھ کرت ہیں۔ للوا کو بھی ...." چھدو نے جرأت
کرتے ہوئے کہا۔

"میرے کان مت کھاؤ۔" لال پیلے ہو کر سینٹری انسپکٹر نے کہا۔

چھدو سہم گیا۔ جس طرح ایک چڑیا باز کو دیکھ کر سہم جاتی ہے لیکن پھر جی

کڑا کر کے یوں گویا ہوا۔

"ہجور میں کھدمت کروں گا۔ میں آتنا اِسان پھراموس (احسان فراموش) نہیں۔ اور ہوں بھی میں بے کسور"۔

خدمت کا لفظ سُن کر سینٹری انسپکٹر صاحب کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

"چھدو۔ ہم کیا کریں۔ صاحب کا حکم ہی ایسا ہے۔ آگے بھی تم خدمت کرتے ہی رہتے ہو"۔

یہ الفاظ نہ تھے۔ اِک تیر تھا جو اُسکے دل کے پار ہو گیا۔ چھدو نے یہ بات سُنی اور ایک سرد آہ بھری۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ مگر آٹھ روپے ماہوار تنخواہ میں سے وہ داروغہ صاحب کے حرص کی آگ کیسے بجھا سکتا تھا۔ گھر کے چار افراد کے علاوہ بالمیک جی کے مندر کے پجاری کی روٹی بھی تو اُسکے ہاں سے جاتی تھی۔ ابھی کل ہی تو کالا سنگھ نے اُسے کوٹھری خالی کر دینے کو کہا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ

تنخواہ دیر سے ملی۔ اور وہ کرایہ بر وقت ادا نہ کر سکا۔

وہ نامراد و مایوس ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔ آہ وہ کتنی امیدیں لیکر آیا تھا۔ وہ سب آن کی آن میں ریت گھروندے کی طرح برباد ہو گئیں۔

شام کی سیاہی سُرعت سے چھا رہی تھی۔ ایسے جس طرح نیکی پر بدی کی طاقت نہایت جلد مستولی ہو جاتی ہے۔ اور غریب چھدو۔ سوسائٹی کا ٹھکرایا ہوا

انسان سر جھکائے سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے جا رہا تھا۔ ایک عظیم الشان کوٹھی میں سے برقی قمقموں کی روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ ریڈیو کا دلنواز نغمہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا لیکن چھدو کے لئے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس کی دُنیا پر کاجل ایسے سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ اُس کی دنیا تہہ وبالا کیجا رہی تھی۔ اس کیلئے مُسّرت وخوشی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔ اُسے اور اُسکے گھرانے کے افراد کو دُکھ درد کی دنیا میں سانس لینے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا اور اگر وہ حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ تو اسکے لئے دھکّے۔ گالیاں۔ طمانچے اور بوٹ کی ٹھوکریں تھیں۔

"نہ رو میرے لال" جمنا نے بچّے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن بچہ برابر آم۔ آم۔ کی رٹ لگا رہا تھا۔

"تیرا بابو ابھی آم لاوت ہے"

اس طرح کی باتیں کر کے جمنا اپنے بچّے بیتل کو بہلا رہی تھی لیکن بالک ہٹ مشہور ہے۔ وہ برابر ضد کئے جا رہا تھا کہ اتنے میں چھدو گردن جھکائے۔ دھیرے دھیرے آتا دکھائی دیا۔ ایسے جس طرح سپاہی کسی مجرم کو پابجولاں جیل خانہ کیطرف لے جا رہے ہوں۔ اور وہ یہ سوچ رہا ہو کہ اب کیا ہوگا۔

جمنا نے اپنے پتی کو جب اس طرح دیکھا تو اسکا ماتھا ٹھنکا کہ بھگوان خیر کرے آج بڑے سُست سُست قدم اُٹھا کر چلا آرہا ہے۔

اس سے پہلے تو وہ دُور ہی سے پکارتا آتا تھا "چودھری سیتل پرساد۔ او چودھری سیتل پرساد"۔ لیکن آج یہ خاموشی بے سبب نہیں "کہو کیا بات ہے۔ خیر تو ہے" جمنا نے پوچھا۔

"خیر کا ہے کی" چھدو کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

"بابو جی نے نوکری سے جواب دے دیا"۔

یہ سنتے ہی جمنا پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا اور جب آنسوؤں کی ندی کا سیلاب کچھ کم ہوا اور پانی پلکوں کے کناروں کو عبور کرتا ہوا گذر گیا حسرت و یاس کی متلاطم ندی کا طوفان گھٹ گیا۔

جمنا نے چھدو سے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں"۔ چھدو نے جواب دیا۔

"پھر بھی"۔ جمنا نے دوبارہ پوچھا۔

"آج سویرے سویرے (سویرے سویرے) جمعدار نے کہا۔ تم کو بابو جی پانچ بجے دپھتر (دفتر) میں بلاوت ہیں۔ وہاں گیا تو نوکری سے جواب مل گیا"۔

جمنا نے آہ بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "بھگوان تیری مرضی"۔

بچہ آم کے لئے بلک بلک کر سو گیا تھا لیکن کسی کو اسکا خیال نہ آیا جب دونوں میاں بیوی دل کا بخار نکال چکے تو جمنا نے شوہر سے کہا "اب کیا ہوگا"۔ چھدو بولا "ہوگا کیا۔ یہی کہ بھوکوں مریں گے۔

اتنا کہہ کر وہ خیالات کی رو میں بہہ گیا۔ اور پھر دفعتہً بڑبڑانے لگا۔ جیسے کوئی ہولناک خواب دیکھ کر چونک اُٹھے۔

اگرچہ الفاظ یہ نہ تھے۔ مگر اُن کا مطلب یہی تھا۔

" پگلی میں سوچ رہا ہوں بھگوان کی یہ لیلا کیسی نیاری ہے۔ پنڈت جی بھی یہی کہتے ہیں اور میں بھی یہی خیال کرتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھگوان ظلم کرنیوالوں پر کیوں خوش رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مظلوموں کا خون چوس چوس کر اپنی طاقت میں اضافہ کریں کیسا یہ نیائے بھگوان کو پسند ہے۔ برہمن اور اچھوت کی تقسیم بھگوان نے کی ہے سرمایہ داری کی تخلیق خدا نے کی یا انسان نے"

جمنا نے یہ سُنکر کہا۔ "چھی چھی کیسی بات کرتے ہو"

اور چھدو بڑبڑا کر چُپ ہو گیا۔

بھکارن

رات مہیب اور بیوہ کے مستقبل کی طرح سیاہ تھی کبھی کبھی برق آتشیں پردۂ سحاب سے اپنا ہیبت ناک چہرہ دکھا کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آن کی آن میں نظروں سے غائب ہو جاتی تھی۔ بارش دھائیں دھائیں کرکے پڑ رہی تھی۔ بازار کی تمام دُکانیں قبل از وقت بند ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں کھیلنے والے تمام آوارہ لڑکے بھی اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ کتے بھی کہیں دُکانوں کے تختوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔ میرے قیام کا دروازہ بازار کی طرف کھلتا تھا۔ کمرہ کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے باہر پڑ رہی تھی میں گالز وردی کے افسانوں کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایکا ایکی دروازہ پر دستک ہوئی۔ سچ پوچھئے تو میں سہم گیا۔ اور جب دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ تو میں نے دل کڑا کر کے دروازہ کھولا۔ میں نے ایک بوڑھی بھکارن کو دروازہ کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا

اُسکا لباس دریدہ اور بوسیدہ تھا۔ جو حاجت رفو سے بھی بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ بارش میں شرابور تھی۔ سردی کے مارے اس کے دانت بج رہے تھے۔ اسکے جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ وہ بھوک سے مضمحل تھی۔ اُس کی یہ خستہ حالت سراپا سوال تھی

نہ جانے میرے دل میں اُسوقت یہ خیال کیوں پیدا ہوگیا۔ اور اب میں ایک راحت محسوس کرتا ہوں اس چھت کے سایہ تلے جہاں اس رات کی ہولناکیوں سے محفوظ رات بسر کر رہا ہوں۔ اگر یہ بھکارن بھی اس خوفناک رات کے چند گھنٹے بسر کرے گی۔ تو میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا

میں نے بھکارن کو کمرے میں آنیکی اجازت دیدی۔ ایک کپڑا اس کے تن ڈھانپنے کو دیا جس سے اسکو سردی سے بہت حد تک نجات مل گئی۔ اس کے بعد میں نے شام کا کھانا، جو میں بھوک نہ لگنے کی وجہ سے نہ کھا سکا تھا۔ جوں کا توں طشتری میں لاکر اسکے سامنے رکھدیا۔ بوڑھی بھکارن ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی کھانے میں مصروف ہوگئی۔ اس درماندگی، غربت، اضمحلال، بدنصیبی میں بھی بھکارن کے چہرے پر ایک عجیب جھلک ہویدا تھی۔ اس کے اوضاع واطوار ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کسی اچھے خاندان کی فرد تھی اگرچہ اب اسکا چہرہ ہجوم غم و آلام کی نمایاں تصویر تھا۔

میں نے بھکارن سے مخاطب ہوکر کہا" تم مجھے کسی اچھے خاندان کی ستم رسیدہ معلوم ہوتی ہو" "ہاں"۔ لیکن وہ یکایک چلا اُٹھی جیسے کوئی مریض ہذیان کی حالت میں پکار اُٹھے" نہیں نہیں۔ مجھے اس بات کے کہنے کا کوئی حق نہیں۔ بلکہ میرے لئے اسکا خیال کرنا بھی گناہ عظیم ہے"۔ مجھے بھکارن کی ان باتوں سے دلچسپی سی پیدا ہوگئی تھی۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ کہ میں اس کے گذشتہ حالات کو سنوں۔ میں یوں گویا ہوا" تمہیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا"

"آپ میری داستان نہ سنیں"

لیکن میرے پیہم اصرار پر وہ یوں گویا ہوئی

"میں یہ نہ بتاؤں گی ـــ میں کون ہوں کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں یہ باتیں بتانا نہیں چاہتی۔ اور ان کی ضرورت بھی نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ میں بھکارن ہوں۔ دربدر کی ٹھوکریں کھانے والی بھکارن۔

شائد قسام ازل نے میری قسمت میں اندوہ وغم ہی ودیعت کیے تھے۔ میں نے اس زندگی میں ایک دن بھی حقیقی چین و آرام نہ پایا۔ میں اسقدر گنہگار ہوں کہ میری سانس سے اس کمرہ کی فضا بھی کثیف اور گناہ آلود ہو رہی ہوگی ؎

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم (مومن)

میری داستان اندوہناک ہے۔ دل کے تاروں کو چھیڑنے سے درد و الم۔ سوز و تڑپ۔ آہوں اور نالوں کے سوا کوئی دوسرا راگ پیدا نہیں ہوگا۔ میں بدنصیب ابھی چار ہی برس کی تھی۔ کہ ماتا پرلوک سدھار گئیں۔ کاش میں بھی مر گئی ہوتی۔ لیکن یہ بدنامیاں۔ رسوائیاں۔ خواریاں کون برداشت کرتا۔ پتا جی نے وعدہ کیا تھا کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ لیکن چار ماہ کے بعد میری نئی ماتا آگئیں۔ باپ کی الفت پر ماتما جانے کدھر چلی گئی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ میری عمر دس سال کی ہوگئی میرے لئے سوتیلی ماں کی مار پیٹ باپ کی جھڑکیاں تھیں گھر بھر میں مجھ سے کسی کو بھی ہمدردی نہ تھی مجھے دو دو دن کا فاقہ ہوتا تھا لیکن کسی کو میری پرواہ نہ تھی۔ اب بھی جب وہ وقت یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میری عمر

پندرہ سال کی ہوگئی۔ میرا بدن نازک و مرمریں تھا۔ موٹی موٹی سُرمگیں آنکھیں گھنی اور لمبی لمبی پلکیں۔ سیاہ گھنگریالے بال۔ دانت موتیوں کی طرح صاف اور شفاف میں معصوم تھی۔ یاسمن کی کلی کی طرح معصوم اور پاک۔ ان ہی دنوں میری شادی کا چرچا تھا۔ اور اس سلسلہ میں میری ماتا اور پتا کے درمیان بحث مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ میں صرف اس سے یہ اندازہ لگا سکی کہ پتا جی میری ماتا جی کی بات ماننے سے انکار کرتے ہیں لیکن دنیا میں تریا ہٹ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ مجبوراً میرے پتا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب میں نے یہ سُنا کہ میری شادی ایک بوڑھے سے ہوگی۔ مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میری امیدوں کی دنیا تباہ و برباد ہوگئی۔ میں نے چاہا تھا کہ شاید شادی کے بعد میرے ارمان۔ میرے خوابوں کی تعبیر پوری ہوگی۔ لیکن تمناؤں کا گھروندا تباہ ہوگیا۔ خود غرض سوتیلی ماں نے روپیہ کے لالچ میں اور بے رحم باپ نے بے رحمانہ طور پر پتنی کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر مجھے جیتے جی اندھیرے غار میں دھکیل دیا۔ مجھے یاد ہے کہ شادی کے باجوں میں میری دبی ہوئی چیخیں نکل رہی تھیں۔ شادیانے میرے لئے پیام مرگ تھے۔ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کے ساتھ مجھے بیاہ دیا گیا۔ میرا دل محبت کا متمنی تھا۔ لیکن وہ یہاں مفقود تھی۔ میں بدنصیب اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ میں کن خوشیوں کا ماتم کرتی۔ میں نے خوشیاں دیکھی ہی کب تھیں۔ لیکن ابھی تک میری مصیبتوں کا انجام نہیں ہوا تھا۔ وہ بیمار ہوئے۔ اور ایسے بیمار ہوئے —— کہ پھر جانبر نہ ہوسکے۔ اب میں ودھوا تھی —— سوسائٹی میں ودھوا ہونا کتنا جرم ہے۔ ودھوا کا لفظ ہی مصیبتوں دُکھوں اور تکلیفوں کا مخزن ہے۔ بہنائیں میرے سایہ سے نفرت کرتی تھیں۔

کنواریاں میرے پرتو سے پرہیز کرتی تھیں۔ میں کسی تقریب میں شامل نہ ہوسکتی تھی۔ گھر بھر مجھے منحوس منحوس کہتا تھا۔ آہ ودھوا ہونا کس قدر عظیم گناہ ہے۔ کتنا بڑا جرم ہے امیدوں کا چمن۔ آہ وہ میں نے لگایا ہی کب تھا۔ تاخت وتاراج ہوگیا۔ پھر میری امیدوں پر۔ میرے مستقبل پر سیاہ بادل چھاگئے۔ کہ میرا دیور حرص وآز کا پتلا میرے حسن کی بہار کو لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے بھی یہ ٹھان لی تھی کہ معصیت کی زندگی بسر نہ کروں گی۔ جب اس نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو میں نے ایک بھیانک رات کو گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہدیا۔ میں نے ایک کپڑے میں چند زیورات اور کچھ نقد روپے باندھے اور اسٹیشن کی راہ لی۔ میرے قدم خود بخود اسٹیشن کی جانب بڑھ رہے تھے میں نے ایک شہر کا ٹکٹ لیا۔ اور گاڑی پر سوار ہوگئی۔ رات بھر گاڑی سوائے چند اسٹیشنوں پر ٹھہرنے کے فرّاٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی اور صبح کو ٹھہر گئی۔ یہاں میں ایک ودھوا آشرم میں داخل ہوگئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کہ شاید باقی دن آرام سے گذر جائیں گے۔ لیکن مجھے ودھواؤں نے بتایا کہ تم جسے سونا سمجھ رہی ہو یہ تو پیتل ہے۔ یہ ودھوا آشرم نہیں۔ بلکہ بدکاری کا اڈہ ہے۔ آہ تم سائن بورڈ سے دھوکہ کھا گئی ہو جب تک تم جوان ہو۔ یہاں پناہ مل سکتی ہے۔ لیکن تمہیں یہاں اپنے جسم کو خیر باد کہنا پڑیگا۔ تم کو فریب دیا جائیگا۔ یہ سنکر میرے ہوش وحواس گم ہوگئے۔ میں دام میں گرفتار ہوچکی تھی۔ آزادی یہاں سے مشکل ہی نصیب ہوگی۔ یہاں ہم پر کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔"

آہ ۔ وہ رات کس قدر ہولناک تھی ۔

آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا ۔ زمین کیوں نہ دہل گئی ۔ بجلیاں کیوں نہ ٹوٹ پڑیں ۔ جس رات میری عصمت کی پاک دنیا کو زبردستی پامال کر دیا گیا ۔

"میں خودکشی نہ کر سکی ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی ۔ میں نے سوچا کہ اب جب میری عصمت لٹ چکی ہے ۔ اب بازار اور آشرم ایک برابر ہیں ۔ میں مزدوری نہ کر سکتی تھی ۔ میرا حسن میرے لیئے وبالِ جان تھا ۔ میں نے خودداری اور عزت و ناموس کو بالائے طاق رکھنے کا ارادہ کر لیا ۔ عزت گئی ۔ خاندانی ناموس گیا ۔ عصمت گئی ۔ اب کیا باقی تھا" یہ کہکر وہ زار زار رونے لگی ۔ باہر بارش ہو رہی تھی ۔ کمرہ میں بھکارن کی آنکھوں نے جھڑیاں لگا رکھی تھیں ۔

"ہاں تو میرے پاس ایک چیز تھی ۔ وہ میرا حسن تھا ۔ جوانی تھی ۔ میں گناہ کے گڑھے میں کود پڑی ۔ بلکہ مجھے دھکیل دیا گیا ۔ آپ کے اس سماج نے ۔ اس سنہرے قوانین والی سماج نے ۔

میرے حُسن کی شہر بھر میں شہرت تھی ۔ بڑے بڑے پارسا در پردہ میری ایک نگاہِ التفات کے منتظر تھے ۔ میرے ایک اشارہ پر جان تک نثار کرنے کے لیئے تیار تھے ۔ میرے دلمیں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی ۔ میں نے سوسائٹی اور اس ظالم سماج سے انتقام لینا تھا ۔ میں بھولے بھالے نوجوانوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی اور ان کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیتی ۔ ان کی مائیں ۔ بیویاں ۔ میرے پاس آتیں لیکن میں اپنے

دل پر پتھر رکھ کر ان کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتی۔ میرے دل میں انتقام کے خوفناک شعلے ہر وقت بلند ہوتے رہتے تھے۔ نجانے میں نے کتنے خاندانوں کے چراغ گل کر دیئے کتنے ہی شادماں گھروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کتنی ہی سہاگنوں کو خون کے آنسو رلائے۔ لیکن کب تک۔ میری جوانی کی شام آپہنچی تھی۔ حُسن ڈھل چکا تھا۔ ہزار ہا روپے مالِ حرام بود جائے حرام رفت کے مصداق آئے۔ اور خرچ ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ قدرت نے مجھے بھوک اور فاقہ کی دنیا میں آباد کر دیا۔ بھوک کس قدر ہولناک ہے۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ بھوک نے مجھے گناہ کے گڑھے میں ڈھکیل دیا۔ اور اب بھوک نے بھیک مانگنے اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ اب میں اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔ یہ کہہ کر بھکارن نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور خاموش ہو گئی۔ میں خاموش و ساکت اس دردانگیز داستان کو سُنکر زندگی کے نشیب و فراز سوچنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے سماج کی حقیقت آئینہ کی طرح عیاں ہو گئی۔

میرے دل میں جو شکوک بیسواؤں کے متعلق تھے وہ رفع ہو چکے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ آسمان پر روشنی کی قندیلیں روشن ہو گئیں۔ چاند اپنی کشتی آکاش پر دھیرے دھیرے کھیتا ہوا دکھائی دیا۔ بڑھیا بھکارن نے کہا

”لیجئے اب میں چلتی ہوں“۔

میں نے بہتیرا اصرار کیا لیکن وہ نہ مانی اور چلدی۔

میں نہ معلوم کتنی دیر تک زندگی کے اس کشمکش اور سماج کے قوانین کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔ لیکن علے الصباح جب میں بیدار ہوا۔ تو میں نے سُنا کہ بازار میں دو

رہگذر یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے
"سماج کے قانون غریبوں کے لئے ہیں۔ امیروں کے لئے نہیں۔

دلچسپ بھول

خورشید اپنے کمرے کی طرف لوٹا۔ وہ دل ہی دل میں "استارہ" کے افسانہ نمبر کے دلکش مضامین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اس نے روانگی کے وقت ایک بک سٹال سے خریدا تھا اور مطالعہ کے بغیر صرف فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بکس میں بند کر دیا تھا۔ وہ اُسے تنہائی میں پڑھنے کا متمنی تھا۔ بجلی کے فیل ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل میں ہر چہار سو تاریکی مسلط تھی۔ جون کے مہینے کی گرم شام تھی تپش کی وجہ سے بجلی کے پنکھے کی ضرورت بری طرح محسوس ہو رہی تھی لیکن بجلی خراب ہو چکی تھی "کیا باہر برآمدہ میں بیٹھنا باعثِ سکون نہ ہوگا۔ شاید اس حدت میں قدرے کمی واقع ہو جائے۔ لیکن پھر وہ کچھ سوچکر اپنے کمرے کی جانب لوٹا۔ برآمدہ میں بھیانک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی مدھم سی روشنی میں اس نے ایک شوخ و شنگ دوشیزہ کو لاابالیانہ انداز میں کٹہرے پر جھکے ہوئے سگرٹ نوشی میں مشغول دیکھا۔ اس کے سلگتے ہوئے سگرٹ کی روشنی اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے خوفناک سمندر کے طوفان میں روشنی کے مینار کی طرح ٹمٹماتی ہوئی مدھم سی لو۔ وہ شب خوابی کے ریشمیں بھڑکیلے لباس میں ملبوس تھی۔ خورشید نے اس دوشیزہ پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے کمرے میں

آکر مسہری پر لیٹ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ شاید وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہو۔ اور میں برآمدہ میں اطمینان سے بیٹھ سکوں۔ پھر وہ سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا لیکن ایسی گرمی میں نیند کہاں۔ آخر وہ کشمیر کے دلکش نظاروں کے تصورات میں محو ہو گیا۔

دروازہ کے ہینڈل کے گھومنے کی آواز نے اُسے یک لخت چونکا دیا۔ دروازہ کھُلا۔ اور دلکش نسوانی آواز نے کسی کو مخاطب کر کے کہا

"اندر آجاؤ۔ ہم رات برآمدہ میں بسر نہیں کر سکتے"

پھر سگرٹ سلگایا اور ترشی سے کہا

"کمبخت ڈبیا میں اب ایک بھی دیا سلائی باقی نہیں"

یہ کہکر اس نے دروازہ کو بند کر کے چٹخنی لگائی اور ——— یوں گویا ہوئی

"دروازہ کے پاس ہی کونے میں ایک کرسی ہے میرا خیال ہے۔ میں اسکو ڈھونڈ سکونگی کاش کمرہ میں روشنی ہوتی۔ اس اندھیرے میں چلنا پھرنا تو کجا سانس لینا تک دوبھر ہے۔ ہر جگہ تاریکی کے بھوت ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔

خورشید نے معاملہ کی اصلیت کو سمجھکر بولنے کی سعی کی لیکن آواز اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ عام طور پر ہوٹلوں میں تقریباً ایک سا ہی فرنیچر ہوتا ہے اور ایک ہی طریقے پر آراستہ کیا جاتا ہے۔

کمرہ میں قدموں کی چاپ اس بات کی مدعی تھی کہ نو وارد نے کمرے کی کونے میں رکھی ہوئی کرسی کو معلوم کر لیا ہے۔ یا یہ اسے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اُسکا سگرٹ اندھیرے میں [illegible] کی طرح چمک رہا تھا۔ اسکا بدن پسینہ میں شرابور ہو گیا۔

اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس نے بے پروائی میں ٹارچ کہاں رکھدی ہے،
اُسنے یہ بہتر سمجھا۔ کہ جُوں کا توں کمرہ چھوڑکر باہر نکل جائے لیکن اسی لمحہ اس کے بستر کے قریب خونخوار کتّے کی غرغراہٹ زور سے سنائی دی۔ دفعتہً ایک باریک اور دلکش آواز نے کتّے کو کہا:" ٹومی بیوقوف مت بنو۔" لیکن خورشید بستر میں دبک گیا تھا اور اسکا دل بید مجنوں کی طرح لرزاں تھا۔ نووارد نے کتّے کو مخاطب کرکے کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کیا وہ شرمیلا خوبرو نوجوان جو ساتھ کے کمرے میں مقیم ہے۔ مجھے دیا سلائی کی ڈبیہ مستعار دے گا۔ کس قدر شرمیلا ہے۔

"ٹومی تم نے دیکھا تھا اُسے۔ وہ کس قدر حسین دکھائی دیتا تھا جبکہ میں نے اسے ڈائننگ ہال میں دیکھا تھا۔ لیکن کتّے نے لمبے سُنا ان سُنا کرکے زور سے سوں سوں کی۔ جیسے کہ وہ شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ لیکن وہ لڑکی برابر کہے جارہی تھی" مجھے یقین ہے وہ نیلگوں رنگ کی، جیسے بہار کے رنگ کے بادل، کار اسی ہی کی ہے۔ کاش ہم بھی سری نگر تک اپنا سفر ایسی ہی شاندار موٹر میں طے کرتے۔ بجائے اس کے کہ ٹیکسی میں ہچکولے کھاتے ہوئے سفر کریں۔" اور پھر ٹھنڈی گہری سانس سنائی دی۔

خورشید یہ سُنکر مضمحل اور متوحش سا ہوگیا۔ اسکا حلق خشک ہوگیا۔ اسنے بولنے ہی کی نہیں بلکہ زور سے چیخنے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

دوشیزہ نے کہا:" آہ۔ کسقدر وحشت ناک اور اُداس رات ہے۔ دیکھتی ہوں۔ شاید بجلی کی رو عود کر آئی ہو۔ بٹن کی ٹِک کی آواز آئی۔ اور دوسرے لمحہ

برقی روشنی نے کمرہ کو منور کر دیا۔

چند لمحوں تک کمرہ میں موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ آخر دوشیزہ نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا "اوہ۔ کیا یہ میرا کمرہ نہیں" خورشید نے نیم باز آنکھوں سے کمرہ کا جائزہ لیا لیکن فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ کتا خوفناک نظروں سے خورشید کی جانب تک رہا تھا۔ جیسے ابھی حملہ آور ہوگا

"کیا مہربانی فرما کر کتے کو بلانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گی"۔

خورشید نے ملتجیانہ انداز سے درخواست کی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا اور اس ہیئت کذائی پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"محترمہ۔ آپ غلطی سے دوسرے کمرے میں تشریف فرما ہیں"۔ خورشید نے کہا۔

"میرے مالک! کیا یہ کمرہ نمبر ۲۶ نہیں ہے"۔

لڑکی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منتشر اسباب کا جائزہ لیا۔

"نہیں یہ کمرہ نمبر ۲۷ ہے۔ خورشید نے جواب دیا۔

"لیکن آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا"۔

اس دلکش اور سریلی آواز میں غصّہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔

لیکن خورشید خاموش، دزدیدہ نگاہوں سے شرابِ حسن سے سیراب ہو رہا تھا۔

"میں ــــ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس وقت بیدار ہوا۔ جب آپ نے کمرہ میں روشنی کی"۔ اس کی آنکھیں خود بخود رُخِ زیبا پر اُٹھ گئیں۔ دوشیزہ کے گلاب سے رخسار۔ کالی کالی زلفیں آنکھیں گہری اور نیلگوں جھیلیں تھیں۔

تھیں۔ اُس کی رعنائی اور دلکشی کو دیکھکر اسپر ایسی حالت طاری ہوگئی۔ جیسے کسی نے اسکو سحر کے زور سے ساکت کر دیا ہو۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپنے میری وہ تمام گفتگو سُن لی ہوگی میں اکثر تنہائی میں کتے سے گفتگو کرنے کی عادی ہوں۔ یہ میری بہت بُری عادت ہے"۔ دوشیزہ نے کہا۔

"نہیں۔ میں گہری نیند سو رہا تھا"

"اس تکلیف کی معذرت چاہتی ہوں۔ آؤ ٹومی چلیں۔ شب بخیر ——"

خورشید نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے کہ وہ فردوسی خواب سے بیدار ہوگیا ہو۔ اُسے معلوم ہوا۔ اسکا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا ہے۔ اس کی حرکت اُسے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ اُس کی رومانی دنیا میں آن واحد میں ایک انقلابِ عظیم بپا ہوچکا تھا۔ اُسپر اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ وہ جھجکتے جھجکتے یوں گویا ہوا۔

"ٹیکسی میں ہچکولے کھانے کی بجائے کیا آپ نیلگوں رنگ کی کار میں میرا ہمسفر بننے کا شرف بخشیں گی"

تمام رات وہ آرام سے نہ سو سکا۔ ہر آن اس کی تصورات کی دنیا بدلتی رہی۔ دوشیزہ کی موہنی تصویر آنکھوں کے سامنے رہی۔

(پلاٹ ماخوذ)
از انگریزی

مُسکراہٹ

"ننھی فریدہ کے نام"

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دنیا جوان تھی۔ اس کی تخلیق کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ آسمانوں پر "انجم کی دیوی" نے دیوتاؤں کی دنیا میں ایک ہلچل سی بپا کر رکھی تھی۔

یہ دیوی تھی۔ خوبصورتی کا پیکر۔ اگر دیوی ہی خوبصورت نہ ہو تو پھر حسین کون ہوگا۔ ہاں! تو دیوی کے حُسن کی یہ اک نامکمل سی تصویر ہے۔

اُس کی زلفیں لیلائے شب کی طرح سیاہ تھیں۔ نرگس اس کے چشم انوار افشاں سے بصارت حاصل کرتی تھی۔ ارغوانی کلیاں اس کے پرتو سے شگفتہ ہوتی تھیں اسکے نقرئی نغمے سُننے کے لئے دیوتے بھی اُڑتے ہوئے پھرتے تھے۔

تمام دیوتاؤں کے دل میں اس کے عشق کی آگ سلگ رہی تھی۔ ہر ایک اسکو حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ دیوتاؤں میں باہمی رقابت کی وجہ سے ہنگامۂ جنگ و جدال بپا ہو جاتا۔

لیکن دیوی کی عقلمندی نے اس تمام چپقلش کا خاتمہ کر دیا۔ دیوی نے کہا:۔ "مجھے آسمانوں اور زمینوں کی مُسکراہٹوں میں جو سب سے زیادہ دلکش ہو، لا دیجئے۔ جو دیوتا میرا تحفہ لانے میں کامیاب ہوگا۔ وہ یقیناً میرا حقدار ہوگا۔

آکاش کے تمام دیوتا تیز رفتار بادلوں پر سوار ہو کر دھرتی اور آکاش پر مطلوبہ مسکراہٹ کی تلاش میں چل دیئے ــــــ

ــــــ ✻ ــــــ

بہار کا موسم تھا۔ پرشباب کیف آگیں ہوائیں چل رہی تھیں۔ عندلیب بہار کی رنگین اور دلکش فضا میں گلستان کی رعنائیوں سے مسحور ہو کر بے ساختہ گل خنداں کو چوم رہی تھی۔ مشرق کی سمت سے شاہ خاور اپنی سنہری رتھ پر سوار ہو کر نقرئی تیر برساتا ہوا نمودار ہو رہا تھا۔ ایسے میں اسکے معطر قطرے رنگین ہو رہے تھے۔ ایک دیوتا نے دیکھا کہ گلاب کی ایک ننھی شرمیلی کلی پتوں کی اوٹ میں سے مسکرا رہی ہے۔ دیوتا نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ اور ننھی کلی کی مسکراہٹ اپنے دامن میں نہایت سرعت سے سمیٹ لی۔ اس نے خیال کیا محبت کی بارگاہ ناز میں یہ تحفہ ضرور قبول ہوگا۔

ــــــ ✻ ــــــ

سورج دن بھر کی مسافت کے بعد پہاڑوں کی دلفریب چوٹیوں کے پار شفق کی رنگین وادیوں میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ دریا کے پرسکون پانی میں ہلکی ہلکی بنفشئی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔ جیسے پانی میں آگ لگی ہو۔ دریا کی نرم و نازک لہریں کناروں کے بوسے لے رہی تھیں۔ اک حسین و جمیل دوشیزہ۔ سراپا حسن۔ جس کے حسن جہانسوز سے شرما کر مہر عالمتاب بھی اپنا منہ چھپا رہا تھا۔

اور ایک خوبرو نوجوان۔ مردانہ حسن کا نایاب مجسمہ۔ شباب کی رعنائیوں کی منہ بولتی تصویر۔ اس کی باہوں میں باہیں ڈالے محوخرام تھا اور یوں کہہ رہا تھا۔

"خورشید میں نے تمہاری یاد اپنے دل میں بسائی ہے۔"

"میری حسین دیوی۔ میرے من کے مندر میں تم ہی پریم کے سنگھاسن پر جلوہ افروز ہو۔ کیا ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتے"

حسین دوشیزہ ان پُرفریب فقروں پر مسکرا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر محبت کے پھولوں کی مسکراہٹ کا بے پناہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اک دیوتا نے جو صبح سے ان لمحات کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس جوڑے کو دیکھا۔ اس نے حسین دوشیزہ کی مسکراہٹ کو سمیٹ لیا۔ اور اپنے دل میں امیدوں کی دنیا بسانے لگا۔

عروس شام نے اپنے سیاہ گیسو بکھیر دیئے۔ آسمان پر ستارے نمودار ہوئے تھوڑی ہی دیر میں چمنستان قدرت میں ہر چہار سو نور کے پھولوں کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دیوتا جو اپنے ساتھیوں سے ذرا کاہل تھا۔ اس نے اسکو زرین موقعہ سمجھا۔ اور اس مسکراہٹ کو سمیٹنے میں محو ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں یہ خیال کرنے لگا کہ "انجم کی دیوی" اس پیشکش کو ضرور ہی نوازے گی۔

ایک ننھا سا بچہ ہنگورے میں ماں کی میٹھی میٹھی لوریاں سُنکر نیند کی پریوں کے سیمیں قہقہوں کے درمیان خوابوں کی حسین وجمیل وادی کی سیر کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مُسکراہٹ تھی۔ ایسے جس طرح بہار میں گلستاں کی نوشگفتہ کلی مسکراتی ہے۔

ایک دیوتا جو بے نیل ومرام آسمان پر واپس جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اس معصوم مسکراہٹ پر پڑی۔ اس نے جھٹ اسے سمیٹ لیا۔ تمام دیوتے اپنے اپنے بیش بہا نذرانے لیکر بارگاہ حُسن میں حاضر ہوئے۔

"انجم کی دیوی" نے تمام مسکراہٹوں کا جائزہ لیا۔

اس میں سے اسکو معصوم مسکراہٹ پسند آئی۔ اور اپنے نقرئی سنگھاسن سے اُٹھ کر دیوتا ...... کے گلے میں اپنی نازک مرمریں باہیں حمائل کر دیں۔

تین حادثے

گاڑی گلاب پور کے اسٹیشن پر رُکی اور میرے کمرہ میں ایک حسین چھبیس برس کا نوجوان داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ لباس سے فارغ البال شہر معلوم ہوتا تھا مگر وہ کسی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے ایک دلفریب تبسم کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں:"

"پریم نگر" میں نے جواب دیا۔

پریم نگر کا نام سنکر وہ ایکا ایکی بول اٹھا۔

"تب تو میرا اور آپ کا ساتھ رہیگا۔ آپ کہاں قیام فرمائیں گے"۔

"میں اولین بار جا رہا ہوں کسی سرائے وغیرہ میں رہائش کا انتظام ہو ہی جائیگا۔

"لیکن میرے غریب خانہ کو کیوں رونق نہیں بخشتے"۔

میں نے ایک لمحہ تک توقف کیا۔ کہ اپنے ہمسفر کی دعوت قبول کروں یا نہ

لیکن یہ دعوت کچھ ایسے خلوص سے ادا کی گئی تھی کہ میں اسے رد نہ کر سکا۔ اور میں نے بصد شکریہ اسے قبول کر لیا۔

"بھلا اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت"

میرے ہمسفر نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیئے تھا۔ کہ آپ نے میری التجا کو نوازا۔ ادھو! مجھے اپنا تعارف کرانا تو یاد ہی نہ رہا۔ مجھے خورشید کہتے ہیں۔ اور پریم نگر کے قریب ہی میری زمینداری ہے۔

"میرا نام "نجم" ہے۔ اور میں ریلے برادرز کا نمائندہ ہوں۔ کاروبار کے سلسلے میں پریم نگر جا رہا ہوں"

جب ہمارا تعارف ہو گیا۔ تو ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں ہم گہرے دوست بن گئے۔ جیسے برسوں کی دوستی ہو۔

سورج دن بھر کی مسافت سے تھک کر آرام کرنے کے لئے لیلائے شب کے قصر سیاہ کی جانب تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ پرندوں کے پرے کے پرے انجن کی بھک بھک سے ڈر کر پھر سے اڑ جاتے تھے۔ جفاکش کسان ہل کاندھے پر ڈالے بیلوں کو ہانکتے گھروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

گاڑی پریم نگر کے اسٹیشن پر ٹھہری۔ یہ چھوٹا سا قصباتی اسٹیشن تھا۔ یہاں چند ایک مسافر ہی اترے۔ گاڑی قریباً دو تین منٹ ٹھہری اور پھر فراٹے بھرتی ہوئی نظروں

سے اوجھل ہوگئی۔

خورشید کا تانگہ ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑا تھا ہم اس میں سوار ہو کر کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ کوٹھی اگرچہ قدیم طرز کی بنی ہوئی تھی لیکن نہایت ہی عالی شان اور فراخ تھی۔ پھاٹک سے برآمدہ تک سڑک تھی۔ اس کے دو رویہ برگد کے بڑے بڑے بلند اور ہیبت ناک درخت تھے۔ کوٹھی کے عقب میں ایک خوبصورت باغ تھا

مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اور معذرت کر کے خورشید کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوکر چائے لیکر آیا جب میں چائے پی رہا تھا۔ تو اس دوران میں میری نگاہیں منتل پیس پہ لگی ہوئی تصویر پر پڑی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی کیا تھی جنت کی حور تھی۔ اس کے بال سیاہ اور لمبے تھے۔ موسم برشگال کی راتوں کی طرح۔ آنکھیں بادام کی سی اور چہرہ خود رو پھول سے زیادہ حسین۔ دلآویز۔ اور سحر انگیز۔

نہ جانے میرے دل میں یہ خیال کیوں حدیقین تک جاگزیں ہو گیا کہ اس تصویر کا اس نوجوان کی زندگی سے کوئی گہرا روحانی تعلق ہو۔ لیکن کیا اس رومان کا حال بھی اندوہناک تھا۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے باتوں ہی باتوں میں تصویر کے متعلق تذکرہ چھیڑ دیا

"آپ کا خیال درست ہے لیکن یہ سلسلہ داستان کی ایک کڑی ہے۔ میری

داستان تو بہت طویل ہے"۔

"طویل!" اور جب میں نے اُسے اپنا طویل افسانۂ غم سُنانے پر مجبور کیا۔ تو وہ یوں گویا ہوا۔

"آپ مجھے دو نوکروں کے ساتھ اسقدر عالی شان اور فراخ کوٹھی میں رہائش پذیر دیکھکر حیران ہوئے ہوں گے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں لوگ مجھے سڑی اور دیوانہ کہتے ہیں میں لوگوں سے بہت کم ملتا ہوں۔ میرا باپ ہاشم خاں علاقہ بھر میں سب سے زیادہ دولت مند اور بارسوخ زمیندار تھا۔ اُس ایسا ہمدرد شخص اردگرد کے علاقہ میں کوئی نہ تھا۔ اور یہی اس کی ہردلعزیزی کا راز تھا لیکن خانگی معاملات میں وہ وحشی اور تندخو تھا۔ بالآخر آئے دن کے جھگڑے میری ماں کی موت کا باعث ہوئے لیکن بحیثیت ایک باپ کے وہ مجھ سے نفور تھا لیکن جائداد کے وارث کی حیثیت سے اُسکا سلوک مجھ سے مُربیانہ تھا۔ اسے جائداد کے لئے ایک وارث کی ضرورت تھی۔ کیونکہ جائداد ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بطور ورثہ چلی آتی ہے۔

(پہلا حادثہ)

اس گھر میں پہلا اور المناک حادثہ میری ماں کی پُراسرار موت ہے۔ ایکدن جب وہ حسب معمول اپنے کمرے سے باہر نہ آئی تو ملازمہ نے جاکر اسکی وجہ دریافت کرنی چاہی۔ اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب اُسنے مالکہ کو بستر میں مردہ پایا۔ ڈاکٹروں نے میری والدہ کی موت کو حرکت قلب بند ہوجانے پر محمول کیا۔

(دوسرا حادثہ)

ہمارے وفادار نوکر جمال کی موت نے ارد گرد کے لوگوں کو بھی تشویش میں ڈال دیا۔ اس کی موت پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں بھی ہوئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن پائیں باغ میں آم کی شاخ کے ساتھ اسکا مُردہ جسم لٹک رہا تھا۔

خودکشی!

لیکن اسے کیا ذہنی یا مالی کوفت تھی جس نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا؟

یہ ایک راز ہے اور اب تک راز ہے۔

(تیسرا حادثہ)

خود میرے باپ کی موت تھی۔ اُسنے بھی خودکشی کر لی۔ اسی آم کی اسی شاخ کے ساتھ شام کیوقت وہ بھی مُردہ لٹکتا ہوا پایا گیا۔ اس دفعہ پولیس نے بڑی محنت کے ساتھ تحقیقات کی لیکن خودکشی کی وجہ معلوم نہ ہو سکی لیکن اس ضمن میں مجھے "نرگس" کا تذکرہ بھی کرنا ہے مینٹل پیس میں لگی ہوئی تصویر "نرگس" کی ہے۔ ہاں تو مصیبت کے ان ایام میں اگر میرا کوئی ہمدرد اور بہی خواہ تھا تو وہ صرف یہی ہستی تھی۔ اور یہ مجھ سے منسوب تھی"۔

"اور اب"۔ میں نے پوچھا۔

"میں نے اس رشتہ کو ختم کر دیا"۔ خورشید نے جواب دیا۔

"وجہ ——"

"دیوانگی ——"

"لیکن مجھے تو تم میں دیوانگی کا ایک شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا"۔

"دوست گرد و نواح کے تمام لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔
"تم سیر و سیاحت سے اپنے دل کو کیوں نہیں بہلاتے۔"
"مجبوری ——"
"کیسی ——؟"
"مجھے وصیت کی رو سے تمام سال یہاں ہی رہنا پڑتا ہے۔"
"تم دیوانے نہیں ہو —— اس وہم اور مبہم خیال کو دل سے نکال دو۔"

رات تیرہ و تار تھی۔ سامنے کے کھیت خوفناک تاریکی میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ درختوں کی شاخوں کے جھومنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دیو زاد زور زور سے سانس لے رہے ہوں۔

میری خوابگاہ میں لیمپ روشن تھا جس کی روشنی دروازہ کے شیشوں سے چھن چھن کر باہر جا رہی تھی

میں نے خوابگاہ کے دروازوں کو اچھی طرح بند کر دیا۔ اور لیمپ کو بجھا کر بستر میں دراز ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد سو گیا۔

خدا کی پناہ؟

آدھی رات کے قریب مجھے کمرہ میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرہ کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پیکر میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند

کرلیں۔یقین کیجئے گا۔اس کے سانس کی آواز میرے کانوں میں ایسے آرہی تھی جیسے وہ میرے چہرے پر جھکا ہو۔دوسرے لمحہ مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کر رہا تھا۔اور کہہ رہا تھا ——

"آم کے درخت کے ساتھ لاش لٹک رہی ہے۔لاش لٹک رہی ہے"

میرا خون منجمد ہو رہا تھا۔اس کے بعد میں کسی جذبہ کے تحت باغ میں گیا۔ واقعی آم کے درخت سے ایک لاش لٹک رہی تھی۔زرد۔گردن اکڑی ہوئی۔ آنکھیں باہر کی جانب نکلی ہوئی۔توبہ۔کس قدر دلخراش منظر تھا۔قہقہہ کی آواز فضا میں گونجی۔وہی پیکر مجھے کمرہ میں چھوڑ گیا۔

دن کافی چڑھ چکا تھا کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

"آپ تو خوب سوئے"۔خورشید نے کہا۔

"سونا کیا ہے"۔اور میں نے تمام واقعہ من وعن اس سے بیان کر دیا۔اس کے چہرے پر مسرت سی دکھنے لگی۔

"نجم کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت"۔میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا۔

"اب میں پاگل نہیں۔بخدا اب میں پاگل نہیں۔

میرے خواب درست تھے۔بالکل درست۔

اب میں دیوانہ نہیں۔ہرگز ہرگز نہیں۔اور نرگس میری ہے۔

رازِ محبّت

میں جوں ہی نجم کے کمرے میں داخل ہوا وہ رو رہا تھا۔
میں یہ دیکھکر مضطرب سا ہو گیا۔
"تم رو کیوں رہے ہو نجم"
"جس کی قسمت میں ہی رونا لکھا ہو۔ وہ رویا ہی کرتے ہیں۔ جن کی زندگی ہی آنسوؤں سے بنی ہو۔ اُن کا رونے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔"
"چھی چھی۔ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔"
"نہیں تو۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔"
"ہو گی"۔ میں نے بے پرواہی سے کہا۔
"لیکن تم یہ تو بتاؤ۔ تمہیں کیا تکلیف پہنچی۔ جو تم نے بچوں کی طرح......"
"نہیں دوست کچھ بھی" نجم نے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں بیکل سا ہو گیا نجم کو روتا دیکھ کر —— یہ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے کالج میں ایک بےفکر نوجوان تھا۔ یہ فارغ البال خاندان کا نونہال۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اس کا اشکوں کا سیلاب بہانا چہ معنی —— جوں جوں

میں اس کے متعلق سوچتا تھا میری عقل کام نہ کرتی تھی۔
میں نے کہا۔ اگر تم نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ نہ کیا تو میں پھر کبھی بھی اس کمرہ میں قدم نہ رکھوں گا۔
"وہ یہ سُنکر سوچ میں پڑ گیا
"تم ۔ تم۔ اس راز کو سنکر خوش ہونے کی بجائے رو دو گے۔ افسوس کرو گے اور بہت ممکن ہے کہ میری حماقت پر ہنسو۔
لیکن اب جبکہ تمہیں اس کے سننے کا بڑا اشتیاق ہے۔ تو لو سُنو"
یہ کہکر اس نے جیب سے ایک ریشمی رومال نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس کے ایک کونہ پر انگریزی میں ("A") لکھا تھا۔
اس میں نیم سنہری بالوں کا ایک گچھا لپٹا ہوا تھا اور ایک خوبصورت ہیئر پن (Hair Pin) تھی۔
"لیکن اس کا تمہارے رونے سے کیا تعلق" میں نے پوچھا۔
"میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ المناک داستان نہ سنو۔ انہیں سے تو اندوہناک افسانہ وابستہ ہے۔ یہ ان کی نشانی ہے"۔
کن کی ــــ" آہ! اُنہی کی جن کی یاد میری زندگی ہے۔ میں تمہیں انکے نام سے آگاہ نہیں کروں گا۔
یہ ــــ میرے دل کی ملکہ ــــ میرے سندر سپنوں کی رانی۔ میری آشاؤں کی دیوی نے مجھے نشانی دی تھی۔ مجھ سے رخصت ہوتے وقت ...... "لیکن

نجم تم نے تو کبھی بھی مجھ سے اس بارہ میں بات نہیں کی۔

وہ چونک اٹھا۔ جیسے خیالات میں کھویا ہوا انسان یکبارگی اسکا احساس کر کے چونک اُٹھتا ہے —— ہاں —— تو وہ —— میں اُن کے ہاں آیا جایا کرتا تھا اور اکثر وہ بھی میرے غمکدہ کو اپنے حُسن جہانسوز سے منور کیا کرتے تھے۔

میں تمہیں تمام داستان نہیں سُناؤں گا۔ تمہیں اس کے متعلق ناراض نہیں ہونا چاہیئے ——" اس ہیرن کی بابت بتا دونگا —— نجم نے کورے پن سے کہا۔

" وہ جا رہی تھیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلیئے —— میرے شہر سے۔ دل میں محبت کی دبی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ تمام وہ باتیں جو دل میں پنہاں تھیں۔ دل چاہتا تھا۔ ان سے کہدوں۔ آرزوئیں مچل گئیں۔ پیامِ محبت ان تک پہنچانے کے لئے لب بیتاب ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ وہ اور میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموش۔ دونوں خیالات میں کھوئے ہوئے۔ میز پر ایک رسالہ پڑا ہوا تھا میں نے اس شعر پر نشان لگا دیا ؎

ہمارے عشق کا معیار کوئی کیا سمجھے
خدا کی بات کو سمجھے تو خدا سمجھے

اور پھر بغیر کسی کام کے کمرے سے باہر آگیا میں نے دیکھا۔ اُنھوں نے وہ شعر پڑھا اور ٹھنڈی سانس لی۔ اور نہ جانے کس خیال میں سینکڑوں دفعہ اس شعر کو گنگنایا کیئے ——

اور جب میں دوبارہ آکر ان کے پاس بیٹھا تو انھوں نے پوچھا۔

"اس شعر پر آپ نے نشان لگایا تھا؟"

"جی ——" میں نے دھیمے سے کہا۔ "یہ غلطی مجھ سے ہی سرزد ہوئی"۔

لیکن خدا معلوم مجھ میں قوت گویائی اسوقت کہاں سے آگئی۔ میں نے اس راز کو جو میں اپنے دل میں پانچ سال سے چھپائے پھرتا تھا۔ اسکا اظہار کر دیا۔ مجھے امید تھی۔ میری محبت ٹھکرائی جائے گی لیکن نہیں۔ نہیں۔

اُنھوں نے میری دردبھری کہانی کو سُنا۔ بڑے اطمینان اور سکون کیساتھ۔ بعض دفعہ وہ مُسکرا بھی دیتے تھے۔ اور میں جھینپ بھی جاتا تھا۔ مجھے ان کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔

"نجم —— میں تمہاری ہوں —— میرے اچھے نجم"۔

نیلی ساڑھی والی

سچ پوچھیے تو کالج بھی ایک قسم کی تفریح گاہ ہے۔ ممکن ہے میرا نظریہ دیگر اشخاص سے مختلف ہو۔ یہاں نہ تو فکر معاش ہوتا ہے اور نہ ہی اسکول کی طرح ماسٹروں کی جھڑکیاں سہنی پڑتی ہیں۔ ہر کالج میں خلیفہ ضرور ہوتا ہے۔ اور پھر خلیفے کے چیلے چانٹے بھی۔ جو خوش فعلیاں اور من مانی کارروائیاں بھی کرتے ہیں۔

یہ ۱۹۳۴ء کا ذکر ہے۔ ہمارے ساتھ تھرڈ ایر میں ایک طالب علم "قادر" داخل ہوا یہ حضرت مولویانہ وضع قطع رکھتے تھے۔ خشخاشی ڈاڑھی۔ بند گلے کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار۔ پاؤں میں زری کی جوتی۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ گویا بالکل الموزے تھے۔ اور کسی جگہ تو شاید سادہ دل اور مولوی نما اشخاص کی مٹی پلید نہ ہو لیکن کالج کے بفکروں سے وہ نجات نہیں پا سکتے۔ ان کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر بھلا ان میں کہاں تاب کہ آئے ہوئے شکار کو ہاتھ سے چھوڑ دیں۔

"قادر" کو بنانے کے لئے بڑی بڑی تجویزیں پیش ہوتیں لیکن ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دی جاتیں۔ سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ ہم سے پرے پرے رہتے تھے۔ ہم میں "نثار" بڑے ہوشیار تھے۔ وہ خلیفہ تو نہ تھے لیکن جانشین کہے جا سکتے تھے۔

ایکدن یاروں نے کہا" چھوٹے خلیفہ - اگر تم نے مولوی کو نہ پھانسا۔ تو ہم تمہیں کاٹھ کا اُلّو ہی سمجھیں گے" یہ سنکر نثار صاحب بولے"۔ یہ مُلّنڑ تو ایک ہی جھانسے میں -"

دوسرے دن ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے نہایت گہرے دوستوں کی طرح نثار اور مولانا کو باتیں کرتے دیکھا۔

نثار نے مجھے اشارے سے بُلایا میں بھی اُن سے ذرا دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب (قادر) اور نثار مذہبی گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد پھر تو یہ ہوا کہ یہ حضرت پہروں تک ہوسٹل میں ہمارے پاس بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے۔ مولوی صاحب نے اگرچہ اپنے مخصوص فیشن کو ترک تو نہیں کیا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ باتوں باتوں میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ آپ خیر سے اس دنیا میں ہی بقول حفیظ جالندھری ؎

زاہد دنیا ہی میں سیکھ حور سے ملنے کے ڈھنگ
ورنہ پچھتائیگا کہ جنت میں بھی رسوائی ہوئی

کا فرادا - تو بہ شکن حسینوں سے یہ ڈھنگ سیکھنا چاہتے تھے۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ آخری ایام تھے۔

موسمِ بہار کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں کرنے کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ بہکی ہوئی رات تھی۔ لارنس کے چمنستان میں اُودی اُودی۔ نیلی نیلی۔ گلابی اور دھانی ساڑھیوں والی تیتریاں محوِ خرام تھیں۔ طوفانِ حُسن میں الفت کے سفینے

ہچکولے کھا رہے تھے۔ ہماری فوج بھی بمعہ مولوی صاحب خلیفہ کی معیت میں دید بازی میں مصروف تھی۔

اتفاقاً مولوی صاحب کے پاس سے ایک "نیلی ساڑھی والی" حسینہ کا گذر ہوا سیب کا سا شگفتہ رنگ، بوٹا سا قد، غزالیں آنکھیں، اور نازک نازک ہونٹوں پہ رقصاں تبسم

بس مولوی صاحب تو اسکو دیکھکر ریشہ خطمی ہی ہو گئے اور لگے سبحان اللہ کرنے یار لوگوں کو ایسا موقع خدا دے جس لمحہ کی انتظار تھی وہ قدرت نے خود ہی مہیا کر دیا۔ اسی رات تمام احباب کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ اور ان حضرت کو اُلو بنانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اس واقعہ سے تیسرے دن آنجناب کو صبح کی ڈاک سے ایک لفافہ خوشبو میں بسا ہوا موصول ہوا۔ مولوی صاحب نے بیقرار دل کیساتھ کھولا ——— پڑھا

" آسمانِ محبت کے درخشاں ستارے۔ خدا تمہاری تابشوں میں اضافہ کرے۔ مریضِ ہجر کا پُر محبت ہدیہ سلام قبول ہو!

کل سے جسوقت سے آپکو باغ میں دیکھا ہے، دنیائے جذبات میں اِک ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے۔ محبت کی آگ دل ہی دل میں سلگ رہی ہے۔ آپ کی یاد۔ دلکش یاد ہی شب تنہائی کی ظلمت افزا خاموشیوں میں تسلی دیتی ہے۔ راحت نواز ہے صرف آپ ہی کا خیال!

کاش آپ سمجھ سکیں کہ عورت زندگی میں صرف ایکدفعہ ہی محبت کرتی ہے۔ آپ

کل مجھے باغ میں ـــــ کنج میں ملیں۔ دیکھئے بھولئے گا نہیں ـــہ

قاصد پیامِ شوق کو اتنا نہ دینا طول
اُن سے فقط یہ کہنا کہ آنکھیں ترس گئیں

صرف آپکی
نیلی ساڑھی والی

مولوی صاحب کو ہم تمام نے فول بنانا شروع کیا" حضرت ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ ممکن ہے امیر گھرانے کی ہو میرے یار مالا مال ہو جاؤ گے سونے میں رنگ دیگی۔" ایک صاحب بولے" کیوں بھئی نثار۔ تمہارا کیا خیال ہے بخدا مجھے ایسا موقع ملے تو کبھی نہ چھوڑوں۔"

نثار نے کہا" مولوی صاحب۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ ماہر عملیات ہیں۔ کیوں مولانا۔ کوئی حُب یوسفی تو نہیں پڑھکر پھونک دیا۔ وَلاّ (واللہ) آپ تو بھئی چھپے رستم نکلے"

مولوی صاحب بڑے تذبذب میں تھے۔ اُسوقت تو کچھ نہ بولے لیکن نثار کو اتنا کہہ دیا کہ ذرا انگلش کے پیریڈ کے بعد کہیں کھسک نہ جانا مجھے تم سے ذرا ـــــ ہاں بس سمجھ گئے نا تم۔"

یار لوگوں نے نعرہ لگایا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

نثار نے مولانا کو وہاں جانے پر راضی کر ہی لیا۔ لیکن تجویز یہ ٹھہری۔ کہ مولانا وہاں اکیلے جائیں۔ اور مولویانہ لباس نہ پہنیں۔ بلکہ کوٹ پینٹ

پہنکر بالکل نیو صاحب بنیں کہیں ایسا نہ ہو۔ پھنسا ہوا شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ اس مقصد کے لئے کالج کے ایک لارڈ (Lord) کا بہترین سوٹ مستعار لینا پڑا۔ مولانا بھی ڈاڑھی مونچھ صفا چٹ۔ چھ بجے کے قریب ہوسٹل میں تشریف لے آئے۔

اب ان کا میک اپ شروع ہو گیا۔ نثار صاحب —— سوٹ کے ساتھ ٹائی کا رنگ (match) کر رہے تھے۔ ایک اور صاحب (stiff) (collar) لگا رہے تھے۔ غرضیکہ اس انہماک اور شان سے (make up) ہو رہا تھا کہ شاید کبھی ہالی وڈ کی کسی "گلیمر گرل" (Glamour Girl) کا بھی نہ ہوتا ہوگا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مولانا سرتا پا انگریزی لباس میں نظر آ رہے تھے۔ مولانا نے آئینہ میں جو اپنا چہرہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہیں اپنے آپ پر دھوکہ ہو رہا تھا۔

یار لوگوں نے مولانا کے وجیہہ ہوئے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ادھر مولانا کا (make up) ہو رہا تھا۔ اُدھر ساتھ والے کمرے میں سریندر کو ایک بھڑکیلا بلاؤز اور نیلی ساڑھی پہنا کر بالکل پری چہرہ نسیم بنا دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ہوسٹل جانے سے پہلے نثار اور سریندر مع دیگر احباب کے کنج میں جا بیٹھے تھے —— اب صرف ان حضرت کا انتظار تھا۔ بارے خدا خدا کر کے مولانا جھومتے جھامتے آئے۔ ان کو ادھر آتا دیکھ کر نثار وغیرہ تو کھسک آئے۔ اور سریندر کو کہہ دیا کہ بچہ خیال رہے۔ مولانا کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس سہگل اور ان کی چند بائیں

کوئی فرق نہ رہے۔

"آپ کے انتظار نے تو مجھے بالکل ہی بیکل بنا دیا تھا شکر ہے کہ آپ تشریف لے آئے" سریندر نے نازک سی نسوانی آواز میں کہا۔

"لو آپ کی پیاری پیاری تحریر پہنچتی اور میں نہ پہنچتا۔ یہ کیسے ممکن تھا"

اور مولوی صاحب نے وہ تمام محبت بھرے فقرات جو اُنھوں نے اس موقع کے لئے زبانی یاد کر رکھے تھے دہرانے شروع کر دیئے

"میرے من مندر کی دیوی ——— میری شمع شبستان حیات مجسمۂ حُسن وخوبی" وغیرہ۔

اور اب ذرا حضرت کھسک کھسک کر قریب آ رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ گردن میں حمائل ہوا ہی چاہتا تھا۔ کہ جوتے کی پٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ مولانا بھونچکے سے رہ گئے۔ مارے تلملا رہے تھے ——— جب یار لوگوں نے دیکھا کہ ان کی خوب تواضع ہوگئی۔ تو لگے ایک ایک کر کے آداب عرض کرنے۔ سُریندر نے ساڑھی اُتار کر پرے پھینکدی۔

مولانا کے مُنہ سے غصّہ کی وجہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اور وہ وہ ملاحیاں سُنا رہے تھے کہ الامان۔

بڑی مشکل سے ان حضرت کو چُپ کرایا۔

اور پھر آہستہ سے ایک لڑکا بولا" حضرت آج تو یکم اپریل ہے۔ اور آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں"

یار لوگوں نے قہقہہ لگایا

دوسرے دن یہ حادثہ کالج میں سب کی زبان پر تھا۔

اس واقعہ کے بعد مولانا کو پھر کالج میں نہیں دیکھا۔ شاید کسی اور کالج میں داخل ہو گئے ہوں۔

نامہ ہائے درد

(یہ خطوط کیا ہیں - ایک دُکھی دل کی پکار - یہ نوحہ اُن مسرّتوں کا ہے جو بیت چکی ہیں - اِک چنگاری ہے جو شعلہ جوالا بن چکی ہے)

جاں نواز :-

تمہارا راحت سے بھرپُور خط ملا - میرے لئے تمہاری مسرّتیں اطمینان اور سکون کا باعث ہیں - کچھ دن اور انتظار کروں گا لیکن کب تک -

سمجھا ہوا ہوں شوخیٔ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

کچھ دنوں سے جذبات کے سمندر میں طوفان کا زور کم ہو گیا تھا لیکن، اب پھر ہیجان پیدا ہو گیا ہے - سمندر طوفان اُٹھنے سے پہلے پُرسکون ہوتا ہے - ایسے ہی میرے دل کی حالت تھی - اس میں جذبات کے تلاطم سے پیشتر اِک سکون پیدا ہو گیا تھا - میری دنیا میں مسرت اور شادمانی کا کیا کام ؟

تمہارا
اختر

راحت نواز:-

میں نے تم سے سو بار التجا کی ہے۔ میرے خط کے لئے بیتاب نہ ہوا کرو۔ ماحول کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ دل بیقرار ہی رہتا ہے "چین کا لمحہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بھولے دوست! تم نے دل کے ناسور کو چھیڑ دیا راحت بھرے لمحے کی یاد۔ ایک چرکہ ہے دل حزین کے لئے ــــ کون ــــ کسی کا ــــ میں مسکرا رہا ہوں۔ تم ابھی تک شکار ہو فریب دوستی کے۔

جسے میں اپنا سمجھوں۔ وہ میرا نہیں۔ اور جسے تم اپنا سمجھو۔ وہ تمہارا نہیں حقیقت تو یہ ہے۔ کوئی بھی کسی کا نہیں ــــ کون کسی کا؟ شاید تمہارا نظریہ درست ہو محبت اک کیف ہے۔ اسکے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ بہر حال مجھے تمہاری سادہ لوحی عزیز ہے۔ الوداع۔

تمہارا

اختر

روح نواز

سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھ سے پوچھتے ہو۔ بیقرار کیوں ہو؟ مجھے شکوہ نہیں۔ تمہیں تمہاری مسرتیں مبارک! مجھے دکھ۔ درد بیقراری

تم کو اصرار ہے میں گیت کیوں نہیں لکھتا۔ بربط کا وہ تار ٹوٹ چکا جس سے دلکش نغمات پیدا ہوتے تھے۔ اب اگر اس میں ارتعاش بھی پیدا کیا گیا۔ تو حزن و ملال سے بھرپور نغمہ نکلیگا جسے سنکر تم افسردہ ہو جاؤ گے۔

میں نہیں آسکوں گا۔

تمہارا

اختر

ظالم

رونے بھی نہیں دیتے۔ سلگتی آگ کو شاید آنسو ہی بجھا سکیں۔ تم چاہتے ہو کہ یہ چنگاریاں شعلۂ جوالہ بن جائیں۔ اور پھر اس آگ سے اک دنیا خاکستر ہو جائے۔

مجھے رونے سے منع نہ کرو۔ اگر آنسو جگر کا خون ہو کر نہ بہے۔ تو پھر اک حشر بپا ہو جائیگا۔ دل کی دنیا میں کبھی کبھی اک دبی ہوئی چنگاری ہی ارد گرد کی ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

تمہارا اختر

پردیسی:-

مجھے دنیا کی پرواہ نہیں۔ میں اس کی پرواہ بھی کیوں کروں؟ زندگی

مجھے زندگی سے موت زیادہ عزیز ہے۔ میں زندہ اس لئے ہوں
کہ زندہ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہوں۔ چراغ سحری کی طرح ٹمٹا رہا
ہوں۔ اجل کا ایک جھونکا اسے بجھا دے گا۔ نہ جانے یہ دیپک
کب بجھ جائے۔ ہر لمحہ انتظار ہے۔

تمہارا
اختر

دوست
دنیا سے دور رہنے کی کوشش کرو۔ تمہارا ننھا سا دل اس کی سفاکانہ
کشمکش کی تاب نہیں لا سکیگا۔ اس دنیا میں کچھ مسکراہٹیں بھی ہیں کچھ
آنسو بھی۔ آلام اور راحتیں ——— لیکن آنسو زیادہ اور مسکراہٹیں
کم۔ آلام کی فراوانی۔ مسرتوں کی قلت۔ اکثر میں پہروں تک یہی
سوچتا رہتا ہوں۔ زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصد زندگی اک بحر بیکراں
ہے۔ شاید۔ اور اسمیں لاتعداد لہریں ہیں۔ غم اور مسرت کی۔ اس
دنیا اور دنیا والوں کو دیکھکر الجھنوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

موت زندگی سے بدرجہا بہتر۔
موت صبح مسرت ہے۔ پُر شکوہ۔
کلفت و آلام سے نجات دلانے والی۔ تم ذرا سوچو۔ جس کو طمانیت

قلب ہی حاصل نہیں وہ کبھی شاد ہوسکتا ہے۔ پروردگار!
تیرے راز سمجھنے سے انسان قاصر ہے!

تمہارا اختر

"میں ماضی؛ سوگوار ہوں"
یہی لکھا ہے تم نے —— نادان تم ماضی کا تذکرہ کر رہے ہو۔ میں مستقبل کو بھی رو چکا۔ پھر آنسو کیوں بہائے جائیں۔
اِس زندگی اور اس کی جھوٹی خوشیوں کے لئے۔ جو کچھ بھی نہیں محض ایک رنگین دھوکا۔

پھر ملیں گے —— تمہارا
اختر

اتنے قریب ہو کر بھی مجھے نہ سمجھ سکے ۔ تمہارے نزدیک زندگی کا مقصد ہے —— م —— ح —— ب —— ت۔ لیکن خدا کے لئے محبت کے متعلق میرا نظریہ دریافت نہ کرو —— عشاق کی دنیا میں ہلچل بپا ہو جائے گی۔
دل کی دنیا کو آباد کرنا چاہتے ہو۔ مورکھ ہو —— جانتے نہیں اس دنیا میں کیا ہے۔ آنسو ہی۔ آنسو۔

تمہارا اختر

دوست :۔

تمہارا خیال سو فیصدی درست ہے۔ چشمہ پیاسے کے پاس
آئے اور پیاسا پھر بھی پیاسا ہی رہے —— تو اس میں
چشمے کا کیا قصور تمہاری قسمت میں پیاسا ہی رہنا ہوگا
تڑپ رہے ہو۔ بیکل ہو رہے ہو۔ کمبخت دل کو جی بھر کے
تڑپنے دو۔ بیقرار ہونے دو۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ ننّھا بچّہ جب
کسی چیز کے لئے ضِد کرتا ہے۔ تو چیز نہ مِلنے پر مچلنے لگتا ہے۔ پھر
روتا ہے۔ اس کے بعد جانتے ہو کیا ہوتا ہے ؟ روتے روتے
نڈھال ہو جاتا ہے۔ پھر وہ روتا ہی نہیں۔ کیونکہ رو ہی نہیں سکتا۔
اپنے دل کو بھی رونے دو۔ بیقرار ہونے دو۔ تڑپنے دو۔ اس کے
بعد ایک سکون حاصل ہوگا۔ پائیدار تمہارا اختر

مخلص دوست !

تمہارا خط کل ہی مِلا ہے۔
کیا کہا تم نے۔ میرے خط نے تمہاری پریشانیوں میں اور بھی اضافہ
کردیا۔ اس دُنیا میں صرف پریشانیاں اور پریشانیاں ہی تو ہیں

تمہارا اختر

مجھے تنہا رہنے دو۔ سچ کہتا ہوں —— بیمار اب اس حد تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں دوا اور دعا دونوں بیکار ہیں۔

تمہاری کوششیں کارگر نہیں ہو سکتیں۔ اگر مجھ سے یہ درد چھین لیا جائے تو میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ ع

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

تم میرے سرمایۂ حیات پر ڈاکہ زنی کرنا چاہتے ہو۔ بخدا میں جیتے جی اپنے متاعِ زندگی کی پوری پوری نگہداشت کروں گا۔ رخصت!

تمہارا اختر

دلنواز —— کیا کہا ؟

میرا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے —— ٹھیک ہے۔

لیکن یہ دیوانہ اپنے متاعِ زندگی کو لوٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا صحنِ گلشن کی سیر کرنے والا اگر پھولوں کی دید سے حظ اٹھانا چاہے تو باغبان کو کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ انھیں نوچنے لگے تو وہ تلملا اٹھتا ہے۔ اگر تم سیر کرنے کی خاطر آؤ۔ تو چشمِ ما روشن دل ما شاد! لیکن اگر تم اضطراب و انتشار کی ننھی ننھی کلیاں نوچنا چاہتے ہو تو میں اسکی اجازت نہیں دوں گا۔

ہاں! میرا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔

"دیوانہ اختر"

پرانے حربے استعمال کرنے لگے۔ یہ ہتھیار تو زنگ آلود ہو چکے
آدم کے خلد سے نکلنے کے بعد ہی سے ان کا استعمال شروع ہو گیا
تھا۔ اب تو یہ کند اور ناکارہ ہو چکے ہیں۔
نئے ڈھنگ نئے انداز اختیار کرو۔ مجھے دوزخ سے ڈرانا چاہتے ہو
کیا انسان کے لئے یہ تمہاری وسیع دنیا دوزخ سے کم ہے۔ مجھے
ان خوش نصیب انسانوں کی فہرست تو بھیجدو۔ جو تمہارے خیال
میں بہشت کے حقدار ہیں۔

"دیوانہ - اختر"

روح نواز!

میں قدرت سے انتقام لے رہا ہوں۔ وہ مجھے نیست و نابود کرنا
چاہتی ہے۔ میں اسکا تمسخر اڑاتا ہوں۔ وہ محجوب ہو جاتی ہے۔

"دیوانہ اختر"

انارکلی

انارکلی میں داخل ہوتے ہی اسکا پہلا خیال یہ تھا کہ یہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ اُسکا دوسرا خیال یہ تھا کہ یہاں ایک دنیائے رومان آباد ہے۔

اُسنے نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا جسکا رنگ کثرت استعمال کی وجہ سے بھوسلا ہو گیا تھا۔ اور جگہ جگہ سے پھٹ کر اپنی کہنگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے ——

اس کے پاس سے دو حسین و جمیل لڑکیاں ساریوں میں ملبوس گذریں۔ اُن کی سیمیں کلائیوں میں ہلکی پھلکی کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ ہونٹ پتلے اور اسقدر سُرخ تھے۔ کہ لالے کی سرخ اور نازک پتیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ راہگیر للچائی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کی نظریں بھی تمام چیزوں سے ہٹ کر صرف ان لڑکیوں کی طرف مرکوز تھیں۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک دوکان کے باہر اس نے ایک عورت کا پلاسٹر کا مجسمہ دیکھا۔ دوکان والوں نے مشہوری کے لئے اُسے ایک ساڑھی پہنائی ہوئی تھی (نہیں بلکہ نہایت بھدّے طریقے سے لپیٹی ہوئی تھی۔)

شیریں فریب —— وہ بڑبڑایا۔ مگر اصلیت کبھی پوشیدہ رہ سکتی ہے ؟

اور اس نے حقارت سے مُنہ دوسری جانب پھیر لیا۔

ایک دم اس کی نظریں ایک لڑکی سے دوچار ہوئیں جو سامنے کی دوکان سے کچھ خریدنے میں مشغول تھی۔ وہ اُسے ایک دو، تین منٹ تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بنڈل ہاتھ میں لئے چلدی۔ اس کی نگاہیں اسوقت تک تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو ئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ننھی سی گلابی رنگ کی بے بی آسٹن کار اس کے قریب آکر ٹھہری۔ اس میں ایک خوبصورت لڑکی انارکلی کی ہنگامہ پرور فضا میں سوئٹر بننے میں مشغول تھی۔ وہ حیران تھا کہ "انارکلی" جہاں قدم قدم پر فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں کیف و نشاط کا دور دورہ ہے۔ وہاں یہ لڑکی خاموش سویٹر بننے میں ہمہ تن محو ہے۔ جیسے وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ یہ سورش و ہنگامہ کیف و نشاط، یہ فتنے۔ اس کے لئے سکوت و سکون سے بڑھ کر ہیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"جوانی —— حُسن —— دولت یکجا ہیں۔

اُسنے لڑکی کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر وہ جھجکا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ رہا ہو۔ اور دوسرے لمحے وہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے چل دیا۔ ایک بہت بڑی دوکان سے ایک خوش پوش مرد اور ایک جوان

عورت جو جوانی کی مہکتی ہوئی رات میں موجودہ تہذیب وتمدن کے نیم عُریاں
لباس میں مزین تھی مسکراتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ اسکو ان دونوں کی ہنسی
ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ اسے کہہ رہے ہوں
"بیوقوف ! تم ایسے مفلس شخص کو انار کلی میں پھرنے کی اجازت نہیں"
اُسنے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی۔ اوہو ! میں نے تو کبھی اپنے بوٹ بھی
پالش تک نہیں کیئے۔ اس احساس سے ذہنی طور پر بجید اذیت ہورہی تھی۔ وہ مضطر
سا ہوگیا۔ امارت کے جو نقوش اس نے دیکھے تھے۔ وہ ان کے خیالوں میں مستغرق
تھا کہ ایک دم کوئی چیز زور سے اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ یہ سائیکل تھی اور
سوار۔ دیدی۔ سوری کہکر یہ جا۔ وہ جا۔ لیکن ٹانگ میں
درد ہورہا تھا۔ پھر اس کے پاس سے شوخ وشنگ لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا
گروہ گزرا۔ وہ فضاؤں میں قہقہے بکھیرتی ہوئی بے حجابانہ جارہی تھیں۔ وہ مغربی
تعلیم اور اس کے اثرات کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا کہ اسے
او باؤ۔ راو بابو) —— او باؤ (او بابو) کی آوازوں نے چونکا دیا۔ اور کسی
نے اُسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کر دیا۔ اُسکی نظروں کے سامنے گھوڑا۔ دو
پہیے تھے۔ ٹانگہ میں ایک لحیم شحیم آدمی غیظ وغضب سے اُس کی جانب گھور گھور کر دیکھ
رہا تھا۔ غم، دُکھ، اور ندامت کی وجہ سے اسکا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ دوسرے لمحے
وہ انار کلی سے جلدی جلدی قدم اُٹھائے جارہا تھا۔ جیسے اس فضا میں دم
گھٹا جارہا ہو۔

بیچارہ ــــــ فضلو

اسکا صحیح نام تو خدا جانے کیا تھا لیکن اسکے ساتھی اسے "فضلو" "فضلو" کہکر پُکارتے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر باغ کے ایک جھاڑی کے گوشے میں اس کے ماں باپ نے اُسے پڑا ہوا پایا تھا۔ وہیں وہ پٹھان بھیک منگوں کے لڑکوں کے ساتھ بڑا ہوا جب چھ سات برس کا ہوا تو بھیک مانگ کر پیٹ پالنا شروع کیا باغ میں ایک درخت کی چھاؤں تلے گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی اس کے ماں باپ کا مسکن تھا۔ وہ بھیک مانگ کر لاتے پیٹ کے دوزخ میں ایندھن جھونکتے۔ اور زندگی کے دن گذارتے تھے۔ اُن کے مرنے کے بعد یہی درخت اسکے جیون مرن کا ساتھی تھا۔ ایک مخلص ہمدرد، رفیق۔ سردیوں کی نم آلود راتیں گرمیوں کے سلگتے ہوئے دن۔ ساون اور بھادوں کے برستے ہوئے مہینوں میں اس درخت کی پُر شفقت آغوش اُسے ماں باپ کی گود کا سکون، راحت عافیت عطا کرتی تھی۔

بارہا پولیس نے آوارہ گردوں میں اُسکا چالان کیا۔ لیکن رہائی کے بعد "فضلو" نے پھر اسی درخت کے تلے ڈیرہ آن جمایا۔ ایک پُرانی سی گودڑی۔

ایک تام چینی کی پلیٹ ۔تام چینی کا ایک پیالہ ۔یہ اسکی کل کائنات تھی ۔صبح اٹھکر وہ گودڑی لپیٹ کر درخت کی شاخ پر رکھ دیتا ۔اور یہ پیالہ ہاتھ میں پکڑ ۔پلیٹ کو بغل میں دبا مانگنے کے لئے نکل جاتا ۔کتنے ہی سالوں سے وہ اسی طرح زندگی کے دن گذار رہا تھا ۔

اسے ایک عادت سی تھی جونہی موٹر کار پاس سے گذری وہ اُسے دیکھنے کے لئے سراپا چشم بنجاتا ۔ یہ عادت جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی ۔موٹریں دیکھنے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن پر چلا جاتا ۔وہاں نیلی ۔سلیٹی ۔سُرخ ۔آسمانی رنگ کی کاریں قطار اندر قطار کھڑی ہوتیں ۔وہ انھیں دُور سے ایسے دیکھتا جیسے کوئی اچھوت دیوی کے درشن کر رہا ہو ۔

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ۔اے کاش ! اُسے کہیں سے الہ دین کا چراغ مل جائے ۔پھر وہ جن کو کہے ۔بس مجھے کچھ نہیں چاہیئے ۔کار ہو ۔بہت ہی خوبصورت کار ۔جس پر وہ سوار ہو ۔اور اُسے اُڑاتا پھرے ۔کبھی انارکلی میں لے جائے ۔کبھی لارنس گارڈن کی سیر کرے ۔مگر ایسا ہوتا نہیں تھا ۔یہ سوچتے ہوئے اُسنے آگے بڑھ کر ایک کار کو دیکھنا چاہا ۔ڈرائیور نے گالیاں دیتے ہوئے زور سے ایک تھپڑ لگایا اور فضلو بیچارا اپنی قسمت کو کوستا ہوا وہاں سے چلدیا ۔

شام کو وہ ایک چکر انارکلی میں لگاتا ۔اُسے یاد تھا کہ نیلے رنگ کی سکوڈا اس جوان لڑکی کی ہے ۔جو عموماً گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر شوپنگ کے لئے آتی ہے اور فورڈ کا ۱۹۳۲ء کا موڈل سیٹھ ہرمجی مل کا ہے ۔جو اپنے آنے کا

پون میل ہی سے اعلان کرتا آتا ہے جس کے مڈگارڈوں پر اُس کی گدڑی سے زیادہ لوہے کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ بازار کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک وہ کاریں دیکھتا جاتا۔

گرمی کا موسم بیت چکا تھا۔ رات کو فضلو نے خوب پیٹ بھر کر پلاؤ کھایا تھا۔ شہر کے ایک مالدار کی بیوی کا چہلم تھا۔ اور اُس نے ایصال ثواب کے لئے دہلی دروازہ کے باغ کے مکینوں کو دعوت پلاؤ دی تھی جتو۔ میرو۔ رحجو۔ نظرو کے ساتھ فضلو نے بھی خوب پیٹ بھر کر چاول کھائے تھے۔ اور زیادہ ثواب دلایا تھا۔ نو بجے کے قریب اُس کی آنکھ کھلی۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ مزدور میوے کے لدے ہوئے ٹوکرے جلدی جلدی لے جا رہے تھے۔ فضلو نے وقت کا اندازہ لگایا کہ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ علاوہ بریں اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ گدڑی لپیٹ کر مانگنے کے لئے تیار ہوا۔ آج کا دن شائد اس کے لئے منحوس تھا۔ کہیں سے ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وقت سے پہلے ہی اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ ابھی سٹیشن کے قریب پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک سُرخ رنگ کی کار آئی۔ اُس نے چاہا کہ جلدی سے نکل کر اطمینان کے ساتھ اُسے دیکھے۔ مگر دوسرے لمحے وہ اس کی جھپٹ میں آ چکا تھا۔ کار کا پہیہ سینے پر سے پھر گیا تھا۔ فضلو نے زور سے ہائے ہائے کہا۔ خون کی قے آئی۔ اور بیہوش ہو گیا۔ راہ گیر اکٹھے ہو چکے تھے۔ رعونت بھرے صاحب نے اس کو پچھلی نشست پر ڈال دیا اور ہسپتال کی جانب لیگیا۔

کار فراٹے بھرتی ہوئی سڑکوں پر سے جا رہی تھی لیکن فضلو اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ وہ رولز رائیس میں اڑا جا رہا ہے۔ اور اس کی تمنّا پوری ہو چکی ہے۔

روئدادِ زنداں

زندگی عزیز ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اس سے سیر ہو چکا ہے وہ متمنی ہے گہری نیند کا۔ ایسی نیند جس سے کبھی بیدار نہ ہو سکے۔

مجھے موت سے پیار ہے!

زندگی ! زندگی ہے بھی کیا مسلسل آہ و زاری بیکسی و اضطراب۔ اور اس کی دبی دبی سہمی سہمی سانسیں ایسی ہیں جیسے بادِ خزاں کا طویل اور غم انگیز راگ۔ ہم موت کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے کسی بچھڑے ہوئے محبوب کو۔ اور اگر اس سے خود ہمکنار ہونا چاہیں تو نہیں ہو سکتے۔

خاموش رات ہے۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے نفیس آوارہ کی طرح بکھر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی سنائی دیتی ہے تمام فضا اُداس کیوں ہے ـــــ ساحلِ مایوسی کی سیاہ لکیر کے ساتھ اک روشنی جھلملا رہی ہے۔

شعاع امید ـــــ کبھی کی بجھ چکی۔ تاریکی کا غلبہ ہوگیا۔ تیرگی ہی تیرگی۔
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے یہ زمین یہ آسمان اک ساز ہے اور اس میں سے
اِک یاس انگیز راگ نکل رہا ہے۔

تصورات میں ایک پیکر متحرک ہوا۔ لو وہ قریب آ گیا
شگفتہ چہرہ۔ دو ہنستی ہوئی آنکھیں۔
تصور نے اک انگڑائی لی ـــــ وہی مسکراتا ہوا پیکر اُداسی و حزن
کی تصویر ہے۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں۔
میں مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے مقدس سرزمین کو ناپاک کرنیوالوں
سے جنگ کرنے جا رہا ہوں اور وہ مجھے الوداع کہہ رہی ہے۔

ٹن ـــ ٹن ـــ دو بج گئے۔

پہرہ دار کے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بارک کی
طرف جا رہا ہے۔ گانے سے وہ نیند کو دور کرنا چاہتا ہے۔ یا اُداس رات
کی پژمردگی سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ تو وہی جانے
گیت کتنا دلسوز ہے۔ شائد اُسے اپنا گاؤں۔ اپنا گھر کھیت اور
محبوب یاد آ رہا ہوگا۔ آہ! گذرے وقت کی یاد بھی کتنی زبردست ہے۔ ہم
اس سے کتنا ہی بچنا چاہیں۔ محفوظ نہیں رہ سکتے۔

"میرے محبوب!

تم نے لہلہاتے کھیت کی منڈیر پر جاتے جاتے دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔
اور کہا۔ مجھے نہ چھیڑنا۔
لیکن تمہارا مطلب اس کے برعکس تھا۔
میں نے تمہیں کہا — ذرا ٹھہرو تو۔
اور تم نے اشارے سے کہا۔ کوئی دیکھ لیگا۔
اور تم پاس سے گزر گئے
اس کے بعد کئی بار ہم نے چھپ چھپ کے ملاقاتیں کیں۔
اب میں پردیس میں ہوں لیکن تم نے کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا۔
خدا کرے مجھے موت ہی آ جائے۔
موت! پہرہ دار بھی موت کا خواہشمند ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔
ایک موت اور اس کے چاہنے والے لاتعداد۔
اس کے دل میں بھی اک آرزو ہے۔ موت کی۔
لیکن کتنا بھولا بھالا ہے۔ شاید یہ نہیں جانتا کہ اس کے محبوب نے تو اُسے کب کا فراموش کر دیا۔

آج تمام دن مجھ پر غم کی ایک کیفیت طاری رہی۔ اِس دوران میں اگر کوئی چیز تسکین دہ تھی۔ تو وہ شوریدہ سر سمندر کی کف آلودہ لہریں بیتاب

ہو کر جیل کی سنگین دیواروں کے ساتھ سر مارتی تھیں ۔ اور پھر شدّت درد سے کراہتی ہوئی سمندر کی لہروں میں مل جاتی تھیں ۔ جیسے جیون ساگر کی لہریں آپس میں ملی جُلی ہوئی ہیں ۔

ہوا کی سنسناہٹ کا شور ۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی تک سنائی دیتا تھا ۔ شام کی تاریکی ایسے پھیل رہی ہے ۔ جیسے موت اپنا سر دہانہ دھیرے دھیرے بڑھاتی ہے

تنہائی !

توبہ ! توبہ ! کس قدر اذیت دہ ہے ۔

یہ زنداں بھی تو اس لیئے آباد ہے کہ اس میں ایک قیدی زندگی کے درد بھرے لمحے گذار رہا ہے ۔ قیدی کے بغیر زندان کی کیا قدر و قیمت ! مُرغِ گرفتار کے بغیر ۔ خالی پنجرہ کس کام کا ۔

دُکھ کے لمحے میرے لیئے ناقابل برداشت نہیں لیکن مجھے بےچینی ہے تو صرف اس بات کی کہ ان کا خاتمہ کب ہوگا ۔ اگر یہ دُکھ مجھے شعلۂ جوالہ بنا کر خاکستر بنا دے تو اچھا ہے ۔

سُلگتی آگ میں جلنا جہنم کے عذاب سے بدتر ہے ۔ لیکن تنہائی کی آگ دھیرے دھیرے میری رگوں میں اُتر رہی ہے مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں ۔ وہ اس دنیا میں تو ممکن نہیں ۔ لیکن پھر بھی اس مسافر کی طرح جو پانی کے دھوکے میں سراب کے پیچھے دوڑتا ہے میں بھی لپک رہا

ہوں اور سچ پوچھو تو میں کبھی گلہ نہیں کرتا ۔شکوہ نہیں کرتا ۔دُکھ آئے تو پروا نہیں سکھ ملے تو خوشی نہیں ۔

میری زندگی تو اس دیئے کی طرح ہے جو گورِ غریباں پر ٹمٹا رہا ہے ۔نہ جانے کس وقت ہوا کا ایک جھونکا اسے زمین پر پٹک دے ۔اور پھر اس کی حالت یہ ہوگی کہ تیل کہیں اور بتی کہیں ۔

زندگی کی شاہراہ پر رینگتے رینگتے تھک گیا ہوں ۔اور بہت جلدی منزل مقصود پر پہنچ جانا چاہتا ہوں

کیا غم واندوہ کے بادل پھٹ جائیں گے ۔ یہ اور بھی تاریک ہو جائیں گے اس سے زیادہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے ۔ کیا یہ دلچسپ بات نہیں کہ دشمن سے مادر وطن کی حفاظت کی خاطر نبرد آزما ہو کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں ۔ تم کہو گے کہ میں نے اسکے لئے بہت زیادہ قیمت ادا کی ہے لیکن اگر مجھے اب آزادی نصیب ہو جائے تو میں پھر سر پر کفن باندھ کر میدان کارزار میں چلا جاؤں ۔

اس خیال سے ہی میرے ان کمزور اور بے سکت بازوؤں میں طاقت عود کر آئی ہے ۔

کل سے تمام قیدی سڑک بنانے کے لئے باہر جائیں گے ۔

اس تنہائی سے تو رہائی نصیب ہوگی ۔ لہلہاتی کھیتیاں نظر آئیں گی

درختوں میں ہری ہری کونپلیں پھوٹ رہی ہو گی۔ پرندے چہچہا رہے ہوں گے کائنات پھر سے جاگ اُٹھے گی۔ چرواہوں کے مدھر گیت فضا میں گونج رہی ہوں گے زمین پر سبزہ ہی سبزہ ہوگا اور چرخ نیلوفری پر شاہ خاور پر شکوہ انداز سے چمک رہا ہوگا۔

لیکن کیا ایسا ہوگا؟ یا محافظ تمام باتیں صرف قیدیوں کے دل بہلانے کیلئے کہہ رہا تھا۔ مجھے اسکا اعتبار نہیں آتا، کہ میں فطرت کی رنگینیوں سے حظ اُٹھا سکوں گا۔

صبح ہوگی۔ پہرہ دار تمام قیدیوں کو زنداں سے نکال کر باہر لے جائیں گے کوئی پتھر کوٹیگا۔ کوئی سڑک پر پتھر بچھائیگا۔ شائد بہت سے لوگ ہوں گے۔ خوب مزہ رہے گا۔ نہ جانے کب تک کام رہے۔ ایک ماہ۔ دو۔ تین۔ یا شائد برس بھر۔ لیکن اتنا تو ضرور ہوگا کہ اس زندگی میں تبدیلی تو ہو گی۔ چونکہ انسان بھی متلون مزاج ہے۔ اس لیئے وہ تبدیلی کو بڑا پسند کرتا ہے۔ اگر موسموں میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ دن رات۔ صبح و شام کا وجود نہ ہو تو اس کے لئے زندگی وبال جان ہو جائے۔

زخموں سے چُور چُور ہوں۔ آہ مجھ سے تو ہلا تک نہیں جاتا کئی دنوں تک کوٹھڑی سے باہر نہیں جا سکوں گا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے خوشی ہے۔ میں مادر وطن کی توہین برداشت نہ کر سکا۔

کمزور انسان کو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج

بلند کرے۔ اگر میرے ساتھی قیدی سے کام جلدی نہیں ہو سکتا تھا تو دشمن سپاہی کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ میرے وطن کی توہین کرتا۔

وہ دن دُور نہیں جب حق و صداقت کی فتح ہوگی اور جبر واستبداد کا خاتمہ ہو جائیگا' انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جنگجو اور آزاد قوم کے افراد کبھی بے عزّت اور بے حمیّت نہیں ہو سکتے۔

میں یہ نہ دیکھ سکا۔ کہ بے قصور انسان نشانۂ ستم بن جائے۔

مجھے تڑاق تڑاق کی آواز نے چونکا دیا۔ اس کے بعد میں اور سپاہی گتھم گتھا ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے ساتھی آپہنچے۔ ورنہ میں اسکا کام تمام کر دیتا۔

یہ باغی قیدی ہے۔ اسے گولی سے اُڑا یا جائے گا۔

ہا۔ ہا۔ جسم کو برباد کیا جا سکتا ہے۔ مگر روح و دل تو برباد نہیں ہو سکتے۔ حق و صداقت کی آواز کو ظلم و جور سے نہیں دبایا جا سکتا۔ جسقدر تشدد کیا جائیگا سچّائی کی آگ زیادہ بھڑکے گی۔ اور ارد گرد کی تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر بنا دے گی۔

رقاصہ کے نام محبّت نامے

بمبئی کی بہترین رقاصہ۔ ماہ افشاں جب بیدار ہوئی تو اُس نے آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے سیاہ گیسو دوش پر بکھرے ہوئے تھے خمار آلودہ آنکھوں سے کیف و مستیاں جھلک رہی تھیں۔ اس نے انگڑائی لی۔ رات کے واقعات ایک ایک کر کے اُسے یاد آنے لگے۔ گذشتہ رات کو وہ کیفے ڈی پیرس میں رقص کے بعد رشید کے ساتھ رولز رائیس میں سوار ہوکر مکان پر آئی تھی۔

جاتی دفعہ رشید نے کہا تھا ـــــ پیاری ماہ افشاں!

میں جا رہا ہوں۔ جاتے ہی تمہیں خط لکھوں گا۔ نہیں نہیں!! خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جانے سے پیشتر مجھے ٹیلیفون کر دینا۔

"نصف شب بیدار رہنے کے بعد میں تمہیں صبح صبح بیدار کر کے تمہاری نیند میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا؟" رشید نے کہا۔

تو خط بھی لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ خط تو جب لکھے جائیں جب کسی سے معذرت کرنی ہو۔

اور ـــــ وہ دونوں مسکرا دیئے تھے۔

یہ طویل خط نہیں ہوگا۔ صرف چند الفاظ
شاید — تم اسے پڑھ کر ہنسو!

ماہ افشاں سوچنے لگی۔ یہ سب مجھ سے محبّت کا دم بھرتے ہیں۔ مجھے خود اب تک سچی محبت کی قیمت معلوم نہیں۔ یہ لوگ مجھے اپنے سر کا تاج بناتے ہیں میرے ہاتھوں کو والہانہ انداز میں چومتے ہیں۔ میرے حُسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ میں ایک چشمہ ہوں۔ جس کو پیاس لگی ہو۔ آئے اور بُجھائے۔

مَیں ایک رازِ سربستہ ہوں اور حسین صورت ہوں جنھیں نفسِ امارہ کے شعلے نے پھونکا ہوتا ہے۔ اُنھیں میرے آغوش میں ٹھنڈک ملتی ہے۔

پرسوں رات جو میرے بازارِ حُسن میں نیا خریدار آیا تھا۔ وہ کیسا خوبصورت اور سجیلا نوجوان تھا۔ وہ مجھے والکیشور لے گیا تھا۔ رات بھیگی ہوئی تھی تمام کائنات نے تاریکی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ جوانی کی طوفانی ندی میں ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔

وہ تو مجھے پرنتیا ہی کہکر پکارتا رہا اور جب وہ جُدا ہونے لگا تو مجھے امید نہ تھی کہ وہ پھر کبھی آئیگا لیکن۔ اگر وہ آجائے۔ تو —

پھر اُسے ایک بیوقوف امیرزادہ کا خیال آیا جس نے اُسے موتیوں کی خوبصورت مالا لاکر دی تھی۔ اس نے بھی محبّت نامہ میں شبِ فراق کی طول طویل داستان لکھی۔

میری اپنی پیاری ماہ افشاں! خدا تمہارے حُسن کو جاودانی تابشیں عطا کرے ۔ تم سے جُدا ہو کر مجھے ایک لمحہ بھر بھی قرار نہیں ۔ تمہاری رعنائیوں اور حُسن جہانسوز سے دل میں اک آتشِ عشق بھڑک رہی ہے ۔

دن کے چین ۔ رات کے آرام سے محروم ہوں ۔ دل کو لاکھ سمجھاتا ہوں ۔ مگر یہ نادان ۔ یہ دیوانہ کچھ سمجھتا ہی نہیں

مجھے اپنی تصویر تو ارسال کر دیں ۔ تاکہ قلب مجروح کو کچھ تسکین تو حاصل ہو جائے ۔

فقط تمہارا

مجھے اس کی کیا پرواہ ! اُس نے جھنجلا کر خیالات کو اس طرف سے ہٹانا چاہا ۔ مگر ایسا نہ کر سکی ۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھی کہ ملازم نے نیلے رنگ اور گلابی رنگ کے دو لفافے لا کر دیئے ۔

اُس نے نیلے رنگ کے لفافے کو چاک کیا ۔

یہ گذشتہ شب کے نو گرفتار صید کی طرف سے تھا ۔

نہایت ہی مختصر

میری چنچل تیتری ۔ میں بخیریت پہنچ گیا ہوں ۔ ملنے کی کوشش کروں گا ۔

ہمیشہ کے لئے

صرف تمہارا

وہ مسکرا دی ۔ ہر ایک شخص مجھے ۔ میری اپنی ۔ صرف تمہارا ۔ لکھتا ہے ۔

جب آئیگا تو دیکھا جائیگا۔

گلابی رنگ کا لفافہ چاک کرنے پر اُس میں سے ایک ہزار روپیہ کا چیک نکلا۔ اور ساتھ ہی رائے صاحب کی طرف سے "تاج محل" میں اُسے ایک ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا۔

ماہ افشاں نے مسکرا کر دونوں لفافے سنگار میز کی دراز میں رکھ دیئے اور خادمہ کو چائے لانے کا حکم دیا۔

خاموشی

بینا ڈرائینگ روم میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کہ جو بات میں نہیں چاہتی کیا وہ ہوکے رہے گی۔ ؟

میں ماتا پتا سے یہ کیسے کہہ دوں کہ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔ میں سرتیش سے کبھی بھی پریم نہیں کرسکتی۔ عمر بھر کا بندھن ٹوٹے نہیں ٹوٹ سکے گا۔

لیکن یہ بات ہوکر ہی رہے گی۔ میں کیسے سمجھادوں کہ میں نے دل کے سنگھاسن پر رمیش کو بٹھالیا ہے۔ میں اُسے والہانہ طور پر پُوج رہی ہوں میں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ خوبرو جوان ہے۔ اعلیٰ قابلیتوں کا مالک ہے۔

نہیں نہیں بلکہ میں نے اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پریم کو دیکھا ہے میں نے آشاؤں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے ناامیدی کی بھیک نہیں ملی۔

میری مُسرت وراحت کی دنیا اس کے دم سے وابستہ ہے۔ اگر میرا یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا ـــــ تو میری زیست کا کچا دھاگہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو رمیش کی ہو جاؤں یا زندگی کا خاتمہ کرلوں۔ رمیش میرے وعدوں پر زندگی کے لمحے گذار رہا ہے۔

میں اُٹھایا ہوا قدم کبھی بھی پیچھے نہ ہٹاؤں گی۔

لیکن والدین یہ چاہتے ہیں کہ میری تمناؤں کی کلیوں کو نوچ کر پاؤں تلے روند ڈالیں۔

سماجی نظام ــــ شرم وحیا، کا تقاضا یہی ہے۔ کہ میں اس بارہ میں ایک لفظ تک نہ کہوں۔ مجھے بھیانک اور اندھیری غار میں دھکیل دیا جائے تو اُف تک نہ کروں۔

نہیں۔نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی۔

خیالات کی الجھنوں سے گھبرا کر وہ اُٹھی اور دوسرے کمرہ میں جاکر الماری میں سے ایک شیشی اُٹھائی۔ اور اس کے چند قطرے حلق میں ٹپکا لیئے۔ زاں بعد اپنے کمرے میں جاکر بستر پر لیٹ گئی۔

(۲)

بینا کے والد کنور مہاراج اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے۔ ان پر مغربی تہذیب نے بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ وہ اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے کہ لڑکی کے لئے موزوں جگہ کالج نہیں بلکہ گھر کی چار دیواری ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر اُنھوں نے بینا کو دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد کالج میں داخل کرا دیا تھا۔

بینا اُن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس لئے وہ اسکی تعلیم پر بے دریغ روپیہ

صرف کر رہے تھے۔ جہاں تک ان کی خوشنودی کا تعلق تھا۔ بیناؔ نے کبھی بھی ان کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ بی، اے پاس کر چکی تھی اور پولیٹیکل سائنس کا ایم، اے کر رہی تھی

اب مہاراج کنور اس کی شادی کی فکر میں تھے۔ کہ اپنے جیتے جی بیٹی کا گھر آباد دیکھ لیں۔ اُنھوں نے کتنے ہی امیرزادوں کا انتخاب کیا۔ لیکن کوئی بھی ان کے معیار پر پُورا نہ اترا۔ بالآخر ..... اُن کے ساتھ کے کھیلے دوست کا لڑکا سریشؔ ان کی نظروں میں قبولیت حاصل کر سکا اور اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بیناؔ کی شادی سریشؔ سے کر دیں گے۔ سریشؔ بھی اپنی عملی زندگی میں کامیاب تھا۔ وہ ایم، بی، ایس تھا۔ دن بدن پریکٹس چمک رہی تھی۔ بیوک کی شاندار کار کے علاوہ عالی شان کوٹھی کا بھی مالک تھا۔

مہاراج کنور کے خیال میں بیناؔ کو سریشؔ کے ہاں کسی قسم کی تکلیف کا امکان نہ تھا۔ مگر وہ شاید اس بات سے بے خبر تھے کہ بیناؔ سریشؔ کو چاہتی ہی نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اور اس نے اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کر لیا ہے وہ اُسکا ہم جماعت رمیشؔ تھا۔

رمیشؔ کے والدین نہ ہی تو امیر تھے اور نہ ہی ان کے پاس بنگلہ تھا۔ اور نہ کار تھی۔ مگر بینا کو اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اُس نے محبت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے وعدوں کے سہارے جیون کے لمحے بسر کر رہے تھے۔

میں پیاسی تھی - میں نے چشمہ ڈھونڈ لیا۔ اب میں کنارہ کشی نہیں کر سکتی
رمیش بینا کی یہ باتیں سنتا اور کہتا۔ بینا ـــــ کیا تم سچ کہہ رہی ہو! مجھے تو اسکا
یقین نہیں۔
بینا کہتی۔ رمیش! تمہاری قسم یہ سچ ہے۔ کیا تم عورت کی فطرت سے
واقف نہیں۔ وہ ایک ہی دفعہ پریم کرتی ہے بیں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔
بینا کے وعدے رمیش کی زندگی تھی۔ بینا ابھی تک کمرے سے نہیں آئی۔
کنور مہاراج بولے۔ پھر اُنھوں نے نوکر سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھولے۔ بی بی
سے جا کر کہو۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔
بابو جی۔ وہ تو اپنے بستر پر بیہوش پڑی ہیں۔ بھولے نے سراسیمہ ہو کر کہا۔
یہ سنتے ہی بینا کی ماتا اور کنور اُسکے کمرے کیطرف لپکے۔ واقعی بینا بیہوش پڑی
تھی۔ کنور نے نبض دیکھی۔ اُس کی رفتار بڑی ہی دھیمی تھی۔
اُسوقت کنور کو تو کچھ سمجھ نہ آئی ماسوائے اسکے کہ سریش کو ٹیلیفون کر کے
بلا لیا جائے
ہیلو۔ سریش!
ہاں۔ میں کنور مہاراج بول رہا ہوں۔ بینا بستر پہ بیہوش پڑی ہے۔ نبض کی
رفتار بہت دھیمی ہے۔
نہیں۔ نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ رات تو بالکل تندرست تھی۔
دیر نہ کیجئے گا۔ اتنا کہہ کر انھوں نے ٹیلیفون کا ریسور رکھ دیا اور کمرہ میں،

بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈاکٹر سریش اپنی کار پر آگیا نبض دیکھی اور کہا کہ بینا نے کوئی زہریلی شے کھالی ہے۔ آپ کو اچھے وقت پر معلوم ہوگیا۔ ورنہ چند لمحوں تک زہر اپنا کام کر چکی ہوتی۔

گھبرائیے نہیں۔ میں دوا دیتا ہوں۔ اس سے بیہوشی دور ہو جائے گی۔

واقعی سریش نے جو دوائی دی۔ اس نے فوراً ہی اثر کیا۔ بینا کی بیہوشی بتدریج کم ہو رہی تھی

بینا کے لمبے لمبے سیاہ بال چہرہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں پڑے ہوئے نازک نازک آویزوں کے موتی ہلکی ہلکی چمک دکھا رہے تھے۔

سریش ٹکٹکی لگائے اس کے حسین چہرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ جب بینا اس کی ہو جائے گی تو وہ ان لبوں کو بیتابانہ چوم لیا کرے گا۔

مگر اسے کیا معلوم کہ بینا اس کی نہیں۔ بلکہ رمیش کی ہو چکی ہے۔ اور اس کی اُمیدوں کا محل آن کی آن میں ریت کے گھروندے کی طرح برباد ہو جائے گا۔

اُس ہی لمحہ بینا نے کروٹ بدلی۔ اور آہستہ آہستہ کہا۔

رمیش اب تو آپ کو میرے وعدوں کا اعتبار آیا۔ میں مر رہی ہوں میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آہ تمہارے بغیر —— یہ جیون —— کس کام کا۔

یہ سُنکر کنور مہاراج کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ زور سے بولے۔

بینا! ــــ بینا!

بینا نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں اور سریش کو دیکھ کر پھر بند کر لیں۔

کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ تمام لوگ کسی گہری سوچ میں متفکر تھے۔ لیکن بینا کی خود کشی کا معمہ حل ہو چکا تھا۔

پردیسی ماہی

لیلیٰ شب نے اپنی لانبی سیاہ زلفیں بکھیر کر کائنات پر ایک سیاہ چادر تان دی تھی۔ آسمان پر دوسری کا دُھندلا سا چاند روشنی کی پھیکی پھیکی کرنیں بے دریغ لٹا رہا تھا۔ خاموش فضا میں ڈھولک کی دھپ دھپ کے ساتھ۔

"اکھیاں[1] دی دے گیا سائیں تے مڑ کے نہ آیا بیوپاری ماہی" کا گیت ہواؤں میں لہراتا ہوا نازو کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس گیت نے اس کے احساسات کو ایک شدید ضرب لگائی تھی۔ محلے میں شادی تھی۔ نوجوان لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ یہ گیت گا رہی تھیں۔ گیت سُنکر نازو کے دل میں درد کی ایک لہر اُٹھی۔ ہجوم خیالات نے اس کے دل و دماغ میں ایک حشر بپا کر دیا۔

شباب! وہ شباب کے اس دور میں تھی جب ایک نوجوان عورت یکسر تمنا بن جاتی ہے۔

دل[2] نال دل ملیا سی۔ پھُل آسان والا کھلیا سی؛

یہ سنکر نازو کا دل چاہا۔ کہ کوئی اسے اسقدر بھینچ بھینچکر پیار کرے کہ اسکی اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جائے۔ اس کی گردن میں کسی کے

---

[1] آنکھوں کا بیعانہ دے گیا۔ مگر آپ پردیس چلا گیا۔ [2] ابھی تو دل سے دل ملا تھا اور امید کا پھول کھلا تھا

طاقتور بازو حمائل ہوں۔

جند[۵۱] ہجرے نے آن دبائی تے مڑ کے نہ آیا بیوپاری ماہی

گیت کے بولوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کے تصورات میں حرکت ہو رہی تھی۔ اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جبکہ شادی سے پہلے وہ سرسوں کے لہلہاتے ہوئے کھیت کی منڈیر پر

بیبا[۵۲] دے راہ جاندیاں

نہ چھیڑ بیگانیاں ناراں

گاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ہر قدم پر قیامت کے فتنے پیدا ہو رہے تھے۔ سامنے کی سمت سے شہاب آ رہا تھا۔ اُس نے چاہا کہ وہ شہاب سے بچکر نکل جائے۔ اُس نے شہاب کو دیکھتے ہی گانا بند کر دیا۔

مگر شہاب اس کی جانب آ رہا تھا۔ نزدیک آکر اُسنے کہا۔ "نازو" —— وہ لجا سی گئی۔

"ابھی ابھی تو کیا گیت گا رہی تھی۔"

وہ خاموش تھی۔ "ارے تم رو ٹھ گئیں۔"

"نہیں۔" اتنا کہکر وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی گاؤں کی جانب چلدی شہاب بُت بنا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یہ نازو اور شہاب کی رومان پرور ملاقات تھی۔ دو نوجوان روحیں محبت کی مدھ بھری مے سے مخمور ہو چکی تھیں۔

---

۵۱ میری جان تو غم ہجر کے ہاتھوں میں ہر گر ماہی سوداگروں کی طرح۔ ۵۲ اے رہرو کسی غیر عورت سے تمسخر نہیں کرنا چاہیے۔

"کیوں[1] عشق دی آگ بھڑکائی تے مڑکے نہ آیا بیوپاری ماہی"

چاند کی رومان پرور راتوں میں۔ وہ کتنی ہی بار ایک دوسرے سے ملے۔ اور پھر اس کی بھنک دونوں کے والدین کے کانوں میں پڑ گئی۔ لڑکیوں نے ایک دفعہ پھر "کیوں عشق دی اگ بھڑکائی" اس بول کو دہرایا۔ نازو کے خیالات نے یکایک انگڑائی لی۔ اُسے اپنی شادی کا دن یاد آیا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کیسری رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس کے گرد سہیلیوں کا جھرمٹ تھا جو اُسے چھیڑ رہی تھیں۔ مگر اسکا تصور شہاب کیطرف تھا سہرہ کی زرتار لڑیوں سے اسکو شہاب کا چہرہ نظر آرہا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ محبّت کی ارمان بھری راتیں کس قدر حسین تھیں جب وہ دونوں کسی کھیت کے کنارے باہوں میں باہیں ڈال کر محبت کے گہوارے میں جھولتے تھے۔ چاند کے سوا اُنھیں کوئی آنکھ نہ دیکھتی تھی۔ مگر نازو کے بیاہ کی خبر سُنکر شہاب فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے کاسے کوسوں دُور چلا گیا تھا۔ وہ بیچاری بے بس تھی۔ اگر ایک طرف محبت تھی تو دوسری طرف خاندان کا خیال تھا۔ آج وہ اکیلی تھی۔ اسے شہاب، رہ رہ کر یاد آنے لگا۔

نازو شدت غم سے رونے لگی گیت کی آواز ہوا میں لہرا رہی تھی۔

نہ ___ آیا ___ نہ پردیسی ماہی گیت کے بولوں کے ساتھ اس کی سسکیاں بھی ہمنوائی کر رہی تھیں۔

---

[1] عشق کی آگ کیوں بھڑکا دی ہے

تلاش ناکام

سڑک گہرے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف تاڑی کی دُکانوں میں مدھم سے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی کانپ رہی تھی جھپٹن لال نے سڑک کو پار کیا اور تاڑی کی دوکان میں داخل ہوگیا۔ اسکا بدن تھکاوٹ سے چُور چُور تھا بمبئی شہر کوئی گاؤں یا معمولی سا قصبہ تو نہیں۔ اور پھر اس شہر کی کونسی سڑک تھی جس کی خاک اس نے نہیں چھانی تھی۔ راستہ میں بھی اس کی یہی حالت رہی کہ وہ پاؤں کہیں دھرتا اور پڑتا کہیں تھا۔

مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اُس کے من میں ایک ہی خیال تھا ایک ہی ارادہ۔ یعنی اپنے گمشدہ بچے کی تلاش۔

یہ اس کے معمول میں داخل تھا کہ آدھی رات گذرنے کے بعد وہ تاڑی کی دُکان میں آتا۔ اُس کا ایک گلاس پیتا اور پھر اپنے چالے کی راہ لیتا۔

رات کی بقیہ گھڑیاں اسکی تنگ و تاریک کوٹھری میں گذارتا۔ اور پھر صُبحدم اس کی تلاش جاری ہو جاتی۔

ایک رات حسب معمول وہ دُکان کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والے کونے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ اُدھر چلا گیا۔ مزاج پرسی کے بعد بنواری نے کہا۔ کہو چھیٹن لال آج کل کیسے گذرتی ہے۔ یہ سنکر اس کی پیشانی پر بل پڑگئے اور اُسنے نہایت بیدلی سے کہا۔

"مجھے تو لڑکے کا فکر کھائے جا رہا ہے۔ کل بنسی کا لڑکا کہہ رہا تھا کہ مادھو کلکتہ کے ایک مارواڑی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں آتا۔" اتنا کہہ کر ایک ہی گھونٹ میں اس نے تاڑی کا گلاس خالی کر دیا۔

"اس نے اپنے بوڑھے باپ کے بڑھاپے کا بھی خیال نہ کیا۔" یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے چالے کی طرف چلا گیا۔

باہر میدان میں دھوبی تاڑی کے نشہ سے مخمور ہو کر بے ڈھنگے سُروں میں زور زور سے گیت گا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا شرابی فلمی گیت بغیر سُر اور تال کے الاپنا شروع کر دیتا تو اس پر ایک دم گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ وہ اُنہیں بُرا بھلا کہتا ہوا، کوٹھری میں چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ یہ بدقسمت انسان اکیلا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ آج سے بیس سال قبل اس کی بیوی۔ بچّہ اور وہ تینوں اس شہر میں روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ بیوی کو مرے ہوئے پندرہ برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اور اب وہ اور اُس کا بچّہ تھے۔ جب اس کی بیوی مری تھی۔ تو بچّے کی عُمر صرف پانچ سال کی تھی۔ وہ اس کے سہارے بیوی کے غم سے بے نیاز ہو کر زندگی کے باقی دن گذار رہا تھا۔ اُسکا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ "میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا لڑکا جوان

ہو گیا ہے۔ اب وہ کمائے گا اور میں آرام سے وقت گذاروں گا ـــــ مگر نہیں وہ تو اب لوٹ کر نہیں آئیگا ـــــ اور یہ سوچتا سوچتا سو گیا۔

اس واقعہ کو کئی برس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر بوڑھے کی تلاش روزاول کی طرح جاری تھی۔ محنت مزدوری کرنے کے بعد وہ شام کو لڑکے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ جہاں اس کے ہم عمر لڑکے دیکھتا، اُن سے پوچھتا" میرا لڑکا تو نہیں دیکھا تم نے؟"

"نہیں"

اور ان کا مایوس کن جواب سُنکر اُس کی نوزائیدہ اُمید دم توڑ دیتی۔ اور بعض اوقات بھوک کی شدت اُسے نڈھال کر دیتی۔

ایک شام وہ انہیں غمگیں خیالوں میں کھویا سڑک کو عبور کر رہا تھا کہ ایک موٹر کی جھپیٹ میں آگیا اور زخموں کی وجہ سے بیہوش ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک لی۔ اور جلدی سے اُسکا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

وہ دھیمے دھیمے بڑبڑا رہا تھا ـــــ وہ کبھی نہیں آئیگا ـــــ میں اکیلا تھا۔ اور اکیلا ہی چلا جاؤں گا ـــــ" لیکن اسے کیا معلوم کہ جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ اُسے مل چکا تھا

بھُولی بسری بات

"مجھے تم سے محبت ہے"
یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں
اُس کی آواز کتنی رس بھری اور میٹھی تھی
اور محبت اس کی آنکھوں میں انگڑائیاں لے رہی تھی
نروپما نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے!

گذُرے برس کے موسم سرما کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے گستاخ جھونکے نروپما کے لانبے لانبے نرم و ملائم بالوں سے شرارتیں کر رہے تھے جنھیں وہ بار بار اپنے رخساروں سے ہٹاتی تھی۔ مگر ہوا کو شاید اس چھیڑ خانی میں مزہ آرہا تھا۔

نروپما نے میرا بازو اپنے نرم و مرمریں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ اور ہم دونوں پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے — بہت پرے سنگتروں کے باغیچوں کے نظارہ سے دل بہلا رہے تھے۔

دھوپ میں پھولوں اور پھلوں سے جھکی جھکی ڈالیاں ایک ناقابل بیان منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہوا میں اک بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اور تھوڑے ہی فاصلہ پر دھوپ میں میرا ٹومی "کتّا لیٹا ہوا تھا۔

"آؤ تو ذرا تھوڑی دیر کے لئے اِدھر اُدھر گھومیں"۔ نرو پما نے کہا۔ آج کا دن کتنا دلفریب ہے۔

"ٹوبی" ہمارے آگے آگے بھاگتا ہوا۔ نہیں بلکہ ہوا میں اُڑتا ہوا جا رہا تھا۔ ماحول سراپا محبّت تھا۔

نہ جانے نرو پما نے ماحول سے متاثر ہو کر کہا تھا" مجھے تم سے محبت ہے"۔ یا یہ عورت کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

"کیا تم جانتے ہو؟"

میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔"کیا؟"

"ہمارے قبیلے میں یہ رسم ہے کہ عورت جب ایک شخص کو منتخب کر کے اُس سے اقرار محبّت کرتی ہے تو پھر دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی"۔

میں یہ سنکر تھرا سا گیا۔ اور میرے دماغ میں کتنے ہی خیالات ایک دم جمع ہو گئے۔

"ٹھیک ہی تو ہے"۔

عورت دنیا میں صرف ایک دفعہ محبّت کرتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت کا دل ایک سرائے نہیں ہوتا۔ وہ محبت صرف ایک انسان سے

کرتی ہے۔ اور وہ دروازہ صرف ایک بار کھل کر ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتا ہے۔
یہ موجودہ تہذیب و تمدّن سے دور افتادہ لوگ دنیاوی و سماجی فلسفہ کو کتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کے اصول کتنے سادہ ہیں۔
مگر تم چھوڑ کر تو نہ جاؤ گے ؟
کرشن چندر کی نیرا نے بھی تو اپنے محبوب سے یہی کہا تھا۔
مگر وہ لوٹ کے نہ آسکا۔ "نہیں، نہیں"۔ میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔
یہ دستور تو دنیا بھر سے انوکھا ہے۔ میں نے آہستہ سے نرویما کو جواباً کہا۔
ہم دونوں بہت دیر تک پہاڑی ندی کے کنارے کنارے گھوما کئے۔
اور جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے خوبصورت پھولوں کا ایک گلدستہ مجھے دیا۔ اس دن میں خلاف معمول دیر سے کیمپ میں واپس لوٹا۔

جہاں مارچ کا مہینہ اپنے ساتھ تمام رعنائیاں لئے پھر واپس آیا۔ وہاں میرے لئے اِس کی تمام دلچسپیاں سوہانِ روح تھیں۔
میں نرویما سے جدُا ہو رہا تھا۔ اور شاید پھر زندگی بھر اس سے دوبارہ ملنے کا موقع نصیب نہ ہوسکیگا۔
روانگی سے دو روز پیشتر سب سامان وغیرہ بھیجا جا چکا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں ایک درخت کے سایہ تلے گھاس پر لیٹا ہوا کسی گہرے خیالات میں گم تھا اور۔ سگریٹ کے دھوئیں میں انھیں بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے حدافق پر نگاہ ڈالی۔ مجھے تمام ماحول۔ تمام کائنات۔ تھکی تھکی سی
اُداس اُداس نظر آئی۔ میں بغیر کسی ارادے کے پہاڑی کی جانب چلدیا۔
میں نے دیکھا کہ نرو پما میری راہ دیکھ رہی ہے۔ اور اس کی گھنی پلکوں
کی اوٹ سے آنسو جھانک رہے ہیں۔ گلاب ایسے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی ہے
نہ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اب اس سے جدا ہو رہا ہوں۔

روانگی سے پیشتر مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ آخری بار اس سے مل لیتا۔ مجھے معلوم تھا
کہ میں محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر احساس فرض کو فراموش کر بیٹھوں گا۔
اب بھی شام کو جب فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ اور اندھیرا گھنی جھاڑیوں
اور درختوں پر اونگھنے لگتا ہے تو ناامیدی احساس جذبات پر طاری ہو جاتی ہے
اور ہوا کی سرسراہٹ یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔
"کیا تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گے؟"

قحط بنگال کے تاثرات

چلتی پھرتی لاشیں

شاید آپ نے دیکھا ہو گا کہ بجلی کے کھمبوں پر ایک بورڈ
لگا ہوتا ہے جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوتا ہے "خطرہ"
دو ہڈیوں کے درمیان ایک دل ہلا دینے والی کھوپڑی ہوتی ہے آنکھیں
اندر کو دھنسی ہوئی اور سفید لمبے لمبے خوفناک دانت ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے
وہ ابھی ابھی جسم کے کسی حصہ میں پیوست ہو کر رہ جائیں گے۔ بعینہٖ انکی یہی حالت تھی
یا یوں سمجھ لیجئے کہ آتشباز جب کوئی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ تو بانس کی
پتلی پتلی قمچیوں پر کاغذ سے منڈھ دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اس مفلوک الحال
اور فاقہ زدہ گروہ کی حالت تھی جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا۔ اندر کو دھنسی
ہوئی آنکھیں پچکے ہوئے زرد گال۔ لمبے لمبے سفید خوفناک دانت۔ رواں دواں
بجلی کے کھمبے کا خطرہ۔ "مجھے ہاتھ نہ لگاؤ"! یہ زندگی اور موت کی کشاکش میں گرفتار
غربت و درماندگی اور فاقوں پہ فاقوں کی کڑی سختیاں جھیلنے والے یہ جانتے ہوئے
بھی کہ زندگی کا دیا چراغ مفلس کی طرح صرف چند لمحوں کا مہمان ہے۔ زندگی کو
بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور گروہ در گروہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک

کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے

یہ انسانی فطرت ہے جس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ ہم زندگی میں موت کے متمنی ہوتے ہیں۔ اور جب موت دروازہ پر آ کر دستک دیتی ہے تو اسے کسی حیلے بہانے سے ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہت سے لوگ۔ انبوہ در انبوہ۔ گروہ در گروہ سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے تھے۔ ننھے بچے بھوک سے بلبلاتے جنہیں مائیں بہلانے کی کوشش کرتیں۔ مگر وہ بھوک سے مجبور ہو کر زور زور سے چیختے اور چلاتے تھے۔

بے بس انسان آسمان کی طرف ایک نگاہ ڈالتے۔ آنکھوں میں آنسو بھر لاتے اور اپنی بے بسی پر آہ سرد بھر کر خاموش ہو جاتے۔

بعض تو رو بھی نہیں سکتے تھے۔ رونا اور گانا بھی تو خالی پیٹ نہیں ہو سکتا۔

یہ گذشتہ سال کی فروری کا ذکر ہے یہی کوئی آٹھ نو بجے کا وقت ہو گا۔ بدقسمت انسانوں کا ایک گروہ سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ ہر راہ گیر کی اسکی مرضی کے بغیر ان پر ایک اچٹتی سی نظر پڑ تی۔ اور وہ تاسف کرتا ہوا گذر جاتا۔ روز قیامت کے متعلق سنا ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہی دھن ہو گی۔ یہ شاید اسکی ایک چھوٹی سی جھلک تھی۔

میں فطرتاً حساس ہوں۔ اور یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسی گروہ میں میں نے ایک جوان لڑکی دیکھی۔ جسکا خوبصورت چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

خاموش گہری ویران ویران آنکھیں۔ بجھی بجھی نظریں۔ سالس درد کی ایک خاموش پکار۔

معاً میں نے سوچا۔ کیا اسکا انجام بھی دردناک ہوگا؟ نہ جانے اُسنے بیتے ہوئے دنوں میں محبت کے کتنے "سنہری سپنے" دیکھے ہوں گے۔ تالاب کے کنارے کیلے کے جھنڈوں میں ہم جولیوں کی سنگت میں

"اے مسافر! تم یہ بھول نہ کرنا!

یہ درد بھرا گیت گا کر دھڑکتے دل کو تسکین دی ہوگی۔

مگر اب آنکھوں میں بھوک تڑپ رہی ہے۔ اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ وہی ہونٹ جن پر کبھی مسکراہٹیں رقصاں ہوں گی۔

یہ سوچ نہ تھی۔ اِک اضطراب تھا۔ اس نے میرے احساس کی تلخی کو شدید سے شدید تر بنا دیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی زور زور سے میرے سر میں ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہا ہے۔ جیسے یہ بدنصیب لوگ برے وقت کی چوٹوں پر چوٹیں کھا رہے ہیں۔

ایکا ایکی میرے خیالات نے پھر کروٹ بدلی۔ اس جوان لڑکی کی زندگی بھی طلسم کی طرف اُٹھی چلی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کے رنگین خواب چکنا چور ہوگئے۔ اور میری نظر دور تک پھیلے ہوئے بے آب و گیاہ میدان تک چلی گئی۔

دنیا کی تمام سماجی اور دنیاوی بُرائیوں کی جڑ بھوک ہے۔ یہ انسان کو

ہر رذیل سے رذیل کام کرنے پر مجبور کردیتی ہے ۔ اس کی شدت کے مقابلے میں مذہبی اور سماجی اصول بے بس سے ہوکر رہ جاتے ہیں ۔ اس بُرے دنوں میں اگر ماؤں نے اپنے بچوں کو ۔ خاوندوں نے اپنی عورتوں ۔ باپ بھائیوں نے اپنے لڑکیوں اور بہنوں کو چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض اپنے آپ سے جُدا کر دیا ۔ وہ تو موردِ الزام نہیں ۔ میرے دل نے کہا ۔۔ کیا اس عُسرت زدہ لڑکی کو بھی ــــــــــ ماں ۔ باپ ۔ بہن ۔ بھائیوں اور دیس سے مُنہ موڑ کر اس نحیف و زار جسم کا سودا کرنا ہوگا ۔ ؟

دل نے کہا "نہیں ۔ نہیں "۔

یہ پھول وقت سے پہلے مُرجھا کر شاخ سے گرنے نہ پائے ۔

اور پھر سوچ ! ــــــ ایک طویل سوچ !!

میری ذہنی کشمکش بتدریج بڑھتی چلی گئی ۔ اور سر نیچا کئے ۔ سوچتا سوچتا چلا گیا ۔

چند روز بعد اتفاقاً میرا گذر پھر اسی راستہ سے ہوا ۔ انسانوں ۔ نہیں بلکہ چلتی پھرتی لاشوں کا ایک مختصر سا گروہ آہ و بکا میں مصرُوف تھا ۔ اُن کی دلدوز چیخیں سنگدل سے سنگدل انسان کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہتی تھیں ۔

جذبۂ ہمدردی مجھے بھی کشاں کشاں اس جانب لے گیا ۔

وہی زرد چہرہ ؛۔ بجلی کے کھمبہ کا خطرہ ! ابدی نیند سو چکا تھا ــــ

باغِ جناں کا اک پھول ـــ بادِ حوادث کے تند تھپیڑے برداشت نہ کرسکا۔ اور آخر کار خاک میں مل گیا۔

جب کبھی وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو میں اپنے آپ کو نفریں کرتا ہوں۔

بزدل۔ ڈرپوک۔ تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی نہ جان سکا۔

اِک "پھول" وقت سے پہلے اپنی شاخ سے گرا اور خاک میں مل گیا۔

ادیب کی موت

انیل بابو نے کتابوں کے انبار میں سے فوٹو کو لاپرواہی سے پرے پھینکدیا۔

"تم اسے اس طرح بے پرواہ ہو کر کیوں پھینک رہے ہو" انیل کی بیوی پر دتما نے کہا۔

"ذرا دیکھنے تو دو۔"

"تم اسے دیکھ کر کیا کرو گی؟ اگر میں نے اسے یوں پھینکدیا ہے تو آخر کچھ سوچکر ہی کیا ہے" انیل بابو ـــــ نے جواباً کہا۔ اور پردتما یہ سنکر خاموش ہو گئی

کتنے ہی مہینوں سے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا تھا۔ گھر کا تمام اثاثہ اور فرنیچر ایک ایک کرکے فروخت ہو چکا تھا۔ اب کتابوں کی باری آگئی تھی۔ علاوہ بریں بیوی کی بیماری اور پانچسالہ بچے کی دِگرگوں حالت نے اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

پردتما نے فوٹو کو پکڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصو
تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے"۔ مگر انیل بابو نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ کیونکہ اُسکا دماغ
اس اُدھیڑ بُن میں مصروف تھا کہ کس کتاب کو رکھے اور کسے فروخت کر دے
مگر اب ان باتوں کو سوچنے کی مہلت کہاں۔ اب تو وہ اِک گمنام سا شخص تھا۔
کبھی زمانہ تھا جب لوگ اس کی کتابوں کے مشتاق تھے۔ اور وہ ملک کے
چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ اب تو یہ کتابیں ردی کے بھاؤ بکیں گی۔ وہ
ادبی موت مر چکا تھا۔ اور ایک ادیب کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی روحانی
تکلیف نہیں۔

"کیا آپ یہ تمام کتابیں رکھیں گے؟" پردتما نے پوچھا۔

"ہاں! ان میں سے کچھ کتابیں ایسی ہیں جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں
میں انھیں جُدا کرنا نہیں چاہتا۔ جب کسی کتاب کو دیکھتا ہوں تو مجھے گذشتہ دنوں
کی یاد آتی ہے۔

یہ لڑکی کون ہے؟"۔ پردتما نے قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔

وہ اس سوال پر جھلا سا گیا۔ "نہیں اس کے متعلق اتنی تشویش کیوں ہے؟
مگر تم پوچھے بغیر نہ رہ سکو گی ـــــ یہ آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے
اس لڑکی سے محبت تھی۔ اور وہ بھی مجھے پیار کرتی تھی۔ میں نے اس سے شادی

کر لی ہوتی ـــــ مگر مجھے اب خوشی ہے کہ میں ایسا نہ کر سکا۔

"اگر آپ نے اس سے بیاہ کر لیا ہوتا۔ تو آج اس بیدردی سے اس کی فوٹو کو نہ پھینکتے۔" اور اُنیل بابو بغیر جواب دیئے کچھ سوچنے لگا ـــــ شاید وہ اپنی محبت اور بیتے دنوں کو یاد کر رہا تھا ـــــ

پانچسالہ سرشش کے قدموں کی چاپ نے اس کے خیالات کا شیرازہ بکھیر دیا۔

"بابوجی!" ـــــ "ننھے جاؤ باہر کھیلو۔ مجھے پریشان نہ کرو

مگر بچّہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور تصویروں کے شوق میں کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

پھر یکایک بول اُٹھا "کیا آپ انھیں سجائیں گے بابوجی؟"

"نہیں! اس چھوٹے سے کمرے میں اتنی جگہ کہاں؟"

"تو پھر ہم اس چھوٹے سے کمرے کو چھوڑ کر بڑا سا گھر کیوں نہیں لیتے؟"

"تھوڑے سے دنوں کے بعد ہم نئے مکان میں رہیں گے جس میں ایک باغیچہ بھی ہوگا۔ اور سرش کے لئے جھولا بھی ڈالیں گے۔

"بابوجی ــ آپ تو ہر بات پر کہتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد.... .... تمہیں نئے کپڑے بنوا کر دیں گے۔ کھلونے خرید کر دیں گے۔ مگر اب کیوں نہیں؟" اور اُنیل بابو نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔ "ہم غریب ہیں۔"

"ہم غریب ہیں۔ تو میں کبھی کسی چیز کے لئے ضد نہیں کروں گا۔"

پانچ سالہ بچہ کی یہ بات سُنکر انیل بابو کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور اُسنے اپنے آنسوؤں کو بصد مشکل ضبط کیا۔

جاؤ کھیلو۔ میرے بیٹے ——— اور وہ پھر کتابوں کو علیحدہ کرنے میں مشغول ہو گیا ———

انیل بابو دن بھر تین چار کتابوں کے مسودے بغل میں دبائے پبلشروں کی دکانوں پر مارا مارا پھرا۔ مگر کہیں بھی اسکو شعاع اُمید کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ دو ایک پبلشروں نے تو خوفناک حد تک صداقت بیانی کا اظہار کیا۔

"آپ کی کتابیں آج کل مقبول نہیں۔ اس ہولناک گرانی کے زمانہ میں جبکہ کاغذ کا دستیاب ہونا۔ جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں" انھیں چھاپنا حماقت ہے

ایک اور پبلشر نے کہا کہ آپ مسودات رکھ جائیں۔ ہم اپنے ادارہ تدوین کو دکھائیں گے۔ اگر اُن کے معیار پر پُورا اُترا تو آپکو معقول معاوضہ دیا جائیگا۔

مگر انیل بابو اسپر رضا مند نہ ہُوا۔ اُسے تو فوری روپے کی ضرورت تھی اور یہاں ایک ہفتہ کی تاریخ۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے گھر کی طرف آرہا تھا۔ جیسے کوئی طالب علم امتحان میں فیل ہو کر آتا ہے۔ یکایک اسے ایک خیال سوجھا اور خوشی کی ایک لہر اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔

"میری وجہ سے ہی بیوی اور معصوم بچہ بھوک اور فاقہ کی تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں۔ اگر میں ان کے لئے اپنی جان کی قربانی دیدوں تو اُن کی زندگی کے

بڑی آسانی سے بسر ہو سکتے ہیں۔

دو برس گذر گئے۔ میں نے اپنی زندگی کا بیمہ بیس ہزار روپیہ میں کرایا تھا پچھلی سہ ماہی تک میں باقاعدہ اس کی اقساط ادا کرتا رہا ہوں۔ یہ سوچتا ہوا۔ وہ ایک کیمسٹ کی دوکان پر پہنچا۔ اور دوائی کی ایک پڑیا خرید کر کے جیب میں ڈالی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پرونما نے پوچھا

"کیوں۔ کہیں کام بنا" "نہیں۔ مگر امید ہے کہ تین چار روز کے اندر سب تکلیفیں دُور ہو جائیں گی۔ انیل بابو نے مسکراتے مسکراتے جواب دیا۔

اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر پرونما کو بھی یقین ہو گیا کہ اُن کی تکلیف کے ایام جلد ہی دُور ہو جائیں گے۔ رات کو سونے سے پہلے انیل بابو نے سریش اور بیوی سے بہت دیر تک باتیں کیں ——

مگر دوسری صبح وہ بیدار نہ ہو سکا۔

اُس کی تمنّا

دینانگر کی دو رویہ آموں کی سڑک پر وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔
پھاگن کے مہینہ کے آخری دن تھے۔ ارد گرد کے کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پیلے
پھول ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں جُھولا جھول رہے تھے۔ آموں پر بُور آ یا
تھا۔ اور پیڑوں پر دیوانی کوئل کو۔ کو۔ کی دلسوز کوک میں غمِ فرقت کے نغمے الاپ
رہی تھی۔

اسی سڑک پر ایک بیل گاڑی میں عورتیں رنگ برنگ کے دوپٹے پہنے سوار
تھیں۔ کبھی کبھی ہوا کے تیز جھونکے سے کسی الھڑ دوشیزہ کی اوڑھنی کا آنچل ہوا میں اڑتا
تو فضا میں کئی نقرئی قہقہے بکھر جاتے۔ گاڑی بان بھی اک بانکا سجیلا نوجوان تھا۔
اور غیر معمولی طور پر بھڑکیلے لباس میں ملبوس۔ دلفریب اور خوش کن ترنم کے ساتھ
ماہیئے کے ٹپے الاپتا ہوا۔ بیلوں کو تیز تیز ہانکے لئے جا رہا تھا۔

اُس کی آواز کا اُتار چڑھاؤ اور بیلوں کی گھنٹیوں کی سُریلی آواز ہم آہنگ
ہو کر اک ملکوتی نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔

اس بیل گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر دو نوجوان آپس میں گفتگو کرتے

ہوئے جارہے تھے۔ جب وہ گاڑی میں سے لہراتے ہوئے دوپٹے دیکھتے۔ تو قہقہے لگاتے۔ اور یہ آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتی۔

لیکن وہ —— ان دونوں سے علیحدہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن آہستہ آہستہ سر جھکائے جارہا تھا۔ اس کی چال عام رفتار سے بھی قدرے سُست تھی۔

کیا زیبو بھی میلہ میں آئے گی؟ اور اگر وہ نہ آئی تو .....

اسی سوچ نے اُسے اردگرد کے ماحول سے بھی بے نیاز کردیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگتا۔ نوری۔ طالعہ۔ اور حشمت اس کی سہیلیاں آئیں تو اسے بھی زبردستی اپنے ساتھ کھینچ لائیں گی۔

زیبو اور اس کی محبت کی داستان۔ گاؤں کی اِک سیدھی سادھی رومانی داستان تھی۔ ایک شام کو جب وہ شہر سے اپنے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔ تو اُسے سوجھا کہ اپنے دوست خوشیا کو ہی ملتا جائے۔

اسی خیال کے پیش نظر اس نے کچی سڑک کو چھوڑ کر گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی کا رُخ کیا۔ زیبو کنوئیں پر پانی بھر رہی تھی۔ نکھرتا ہوا شباب۔ متوالی آنکھیں۔ بُوٹا سا قد۔ وہ قدرے ٹھٹکا۔ دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ زیبو نے جلدی جلدی سر کی اوڑھنی دُرست کرنا شروع کی۔ اور وہ دل میں دردِ محبت کی ایک ہلکی ہلکی کسک لئے خوشیا کے گھر کی جانب چلا گیا۔ اُن دونوں کی محبت اُسوقت پروان چڑھی

جب وہ خوشیا کی مدد کے لئے گیہوں کی فصل کاٹنے زیبو کے گاؤں پریم نگر میں آیا۔

جیٹھ کی چلچلاتی دھوپ میں پسینہ میں شرابور کسان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُن کی تیز تیز درانتی کی سڑڑ سڑڑ کی آواز۔ بچوں اور عورتوں کا پولیاں جمع کرتے وقت شور و غوغا۔ اور اسی دوران میں کسانوں کا چھاچھ کے لئے بیقرار ہونا۔ عجیب سماں تھا۔

زیبو چھاچھ پلانے پر مامور تھی۔ جوانی کے نشہ میں مست۔ دل میں محبت کے خواب۔ چھاچھ پیتے وقت وہ جان بوجھ کر تاخیر کرتا۔ نہ جانے یہی چھاچھ اس کے لئے کیا بن جاتی —— بیچارے کسان۔ امرت اور مینا کے تصور سے بھی آشنا نہیں۔ تو اس کے ساتھی چلاتے۔ ارے کیا تمام چھاچھ تم ہی پی جاؤگے؟

ایک دن اس نے اِدھر اُدھر دیکھکر یاس و اُمید کے مِلے جُلے جذبات میں سہمے سہمے زیبو کی کلائی پر ہلکی سی چٹکی لی۔ تو زیبو نے مُسکراتے ہوئے کہا جب میں نے چٹکی بھری تو مضبوط کلائی کا خون جم کر رہ جائیگا۔ تو اُس نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زیبو کا ہاتھ لگتے ہی اس کے بدن میں اِک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔

اتنے میں کسی نے دُور سے پکارا۔ ارے زیبو چھاچھ تو پلا۔ پیاس سے دم نکل رہا ہے۔ وہ مُسکراتی مسکراتی اک نگاہ غلط انداز ڈال کر جلدی جلدی قدم اُٹھاتی چلی گئی

یہ تھی ابتدائے محبت۔ پھر اس کے بعد اندھیری راتوں میں بوڑھے جامن کے گھنے اور تاریک سایہ میں اُن دونوں کے درمیان محبّت کے قول وقرار ہوئے۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھی "پریم نگر" میں جاتا اور دُور ہی سے زیبو کو دیکھکر دل کو ایسے تسکین دیتا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اچھوت۔ مقدس دیوتا کے درشن کرکے اپنی بے پایاں عقیدت ومحبّت کا اظہار کرتا ہے۔

دیہاتی محبت پارکوں اور سینماؤں میں رُسوا نہیں ہوتی۔ پریمی سینے میں محبت کی آگ دبائے رکھتے ہیں۔ مگر عموماً یہ آگ اُسوقت شعلۂ جوالہ بن جاتی ہے۔ جب کوئی بوڑھا زمیندار یا نمبردار اپنی زمین اور روپیہ کے بل بوتہ پر دیہات کی الھڑ دوشیزہ کو اس طرح لے جاتا ہے۔ جیسے بھوکا شکاری باز اپنی ایک جھپٹ سے ننھی سی چڑیا کو اپنے پنجوں میں دبوچ کر پہنائے آسانی میں گم ہو جاتا ہے۔

زیبو نے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اسے بڑے پیر صاحب کے میلہ پر ملے گی۔ اسی دُھن میں وہ سوچتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اس کے دل میں کتنی ہی تمنائیں اور آرزوئیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ وہ زیبو کو بوڑھے منہاری والے کی دُکان سے بہت ہی خوبصورت چوڑیاں۔ ریشمی رومال اور چاندی کے بُندے لیکر دیگا۔ جو ہر سال میلہ پر عورتوں کی دل پسند چیزیں لاتا ہے۔ وہ لاکھ کہتی ہے۔

نہیں! نہیں!! درکار نہیں۔ مگر وہ اس کی ایک بھی نہ سنے گا۔

میلہ کے شور و شغب کی آوازیں دُور دُور سے سُنائی دے رہی تھیں۔ اور جوں جوں یہ آواز نزدیک سُنائی دیتی تھی، اُسکے قدموں میں بھی پھرتی آتی جاتی تھی۔

میدان میں ایک طرف مداری کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ اپنے کمالات فن کا مُظاہرہ کر کے سادہ لوح دیہاتیوں کو محو حیرت کر رہا تھا۔

اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک بوڑھا کسان اکنارے پر ڈھول شہزادہ کی عشق و محبت کی داستان سنا رہا تھا۔

فضا بناسپتی اور تیل کی مٹھائیوں کی سڑاند سے بسی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی بمشکل میلہ کے پڑاؤ میں قدم ہی دھرا تھا کہ سپاہی کی رعونت بھری آواز نے اُسے وہیں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

"میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"اسٹیشن پر۔"

ڈپٹی صاحب دورہ پر آئے ہیں۔ ان کا سامان اسٹیشن سے لانا ہوگا۔ اور اسکے ساتھ ہی سپاہی نے دبی دبی زبان میں ڈپٹی صاحب اور اسکے سارے خاندان کو صلواتیں سُنا دیں۔ جس کی آمد کی وجہ سے میلہ کا لُطف جاتا رہا۔ اور

اک ناقابل بیان خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ اُس نے سپاہی کی ہزار ہزار منتیں کیں کہ وہ کسی دوسرے آدمی کو بیگار میں لے جائے۔ مگر اس کی تمام التجائیں رائیگاں گئیں۔ یہ نیلی اور سرخ پگڑی والے —— بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔

بانکے سجیلے نوجوان۔ اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں لگاتے ہوئے گھوڑ دوڑ کے میدان کی جانب لے جا رہے تھے۔ سال بھر کے بعد تو نمائش کا یہ موقع ہاتھ آتا ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق دوسرے کو شکست دینے کے لئے کوشاں تھا۔

ہر ایک گھوڑے کے گلے میں چاندی کی حمائل جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ وہ اُنھیں دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ دس میل کے فاصلہ سے سامان لا کر تب اس کی خلاصی ہوگی

ایکا ایکی بڑے توندوالے سراپا فٹ بال تھانیدار کی بجلی کی طرح کڑکتی ہوئی آواز نے اس کے خیالات کا تمام سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ "بدماش" ابھی تک کھڑا کیا سوچ رہا ہے۔ اور آناً فاناً اُن موٹی موٹی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور دوسرے لمحہ میں تڑاق تڑاق بید کی ضربوں کی بارش شروع ہو گئی۔

"مجھے جانتے نہیں"

"میرا نام سن کر بڑے بڑے بدمعاش تھرا اٹھتے ہیں" تھانیدار صاحب نے اپنی لمبی لمبی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ تاکہ ارد گرد کے لوگ سنکر مرعوب ہوجائیں۔

وہ فریاد مجسم۔ سہمے اور سسکتے ہوئے ارمان لئے، دوسرے بیگار دول والوں کے ساتھ بید کی مار کے نیلے نیلے نشانوں کو سہلاتا ہوا سر جھکائے سپاہی کے پیچھے پیچھے چلدیا میلہ کی گھما گھمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شور و غل کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ مداری اپنے کرتب دکھانے اور بوڑھا ڈھول شہزادہ کی رومانی داستان سنانے میں مصروف تھے

ایک بار اس نے آسمان کیطرف دیکھا ایک طویل سرد آہ بھری۔ آہ —
اس کی تمام تمنائیں اور حسرتیں دم گھٹ کر رہ گئیں

کھڑکی میں سے

"پنچھی اڑ گیا!"

نیاز نے مُسکراتے کہا

"کب؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"کل رات کو۔"

"اور تمہیں کیسے معلوم ہوا" کھڑکی جو صبح سے بند ہے۔ تم بھی شرلک ہومز ثانی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی وجہ قرار دی جا سکتی ہے۔ میں نے طنز سے کہا۔

"میری بات کا یقین کرو۔ کشوری ابھی ابھی مُنہ بسورتا ہوا آیا تھا کہ اُس کی نئی نویلی دُلہن موہنی کل رات سے غائب ہے۔" نیاز نے کہا۔

اتنا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اُسی نند ولونڈے کے ساتھ رفو چکر ہو گئی ہو گی جو گذشتہ چند دنوں سے بال سنوار کر بھونرے کی طرح کھڑکی کے ارد گرد منڈلایا کرتا تھا۔

مجھے بیچارے کشوری کی حالت پر افسوس بھی تھا اور مسرت بھی۔ افسوس اس لئے کہ وہ پھر اکیلے کا اکیلا ہی رہ گیا۔ اور مسرت اس بات پر کہ میری پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

لونڈیا کے رنگ ڈھنگ دیکھکر میں نے نیاز سے کہا تھا۔ کہ یہ چند دنوں تک فرار ہو جائے گی۔ جس کی تعبیر پوری ہو گئی تھی۔

میرے دفتر کے سامنے ایک بنگلہ ہے۔ جس میں اینگلو انڈین لوگ اقامت پذیر ہیں۔ اُسکے باورچی خانہ کی ایک کھڑکی دفتر کی جانب کھلتی ہے۔ اور کشوری اسی بنگلہ میں باورچی کا کام کرتا ہے۔

تین سال سے دفتر کی اُسی دیمک خوردہ کرسی پر ڈٹا ہوا ہوں۔ وہی پرانی میز اور اُسپر گرد و غبار سے اٹی ہوئی دبیز دبیز فائلیں۔ وہی دفتر اور وہی بنگلہ۔ غرضیکہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ماسوائے اس کھڑکی کے۔ جو کھڑکی پہلے کبھی کبھار کھلتی تھی۔ اب دن بھر کھلی رہتی تھی۔ اور نہ جانے باورچی کے ملنے والے حشرات الارض کی طرح کہاں سے پیدا ہو گئے۔ دن بھر ملنے والوں کا اِک سلسلہ جاری رہتا۔ کہ اس میں رات کے دس بجے تک بھی کمی واقع نہ ہوتی۔ اور اسکا باعث تھی موہنی ——

موہنی جب سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی وہ تنہا موش خاموش چہرہ جس پر کبھی مُسکراہٹ کی جھلک بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ اب مسرّت کا مرکز تھا۔

باورچی خانہ جس کی تمام تر زیب و زینت ایک چٹائی تھی۔ اس کی جگہ اب کھاٹ نے لے لی تھی۔

موہنی کوئی اتنی حسین تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی جوانی —— جوانی ہے۔ اُسکا گداز

جسم۔ کھلتا ہوا رنگ۔ تیز وطرار آنکھیں۔ پتلے پتلے ہونٹ جن پر ہر وقت سُرخی کی ایک تہہ جمی رہتی۔

یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اگر چند دل پھینک موہنی کو دیکھیں اور پھر انکے حلقہ میں چہ میگوئیاں نہ ہوں۔

مقامی سینما میں بمبئی ٹاکیز کی مشہور فلم "قسمت" ریلیز ہوئی تھی۔ اور اسی شام کو میں نے دیکھا کہ موہنی بھی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی پہنے عندلیب پُر بہار گلشن جوانی کی طرح چہکتی ہوئی کشوری کے ہمراہ خراماں خراماں جارہی تھی۔ اور راہ چلتے نوجوان ــــ آنکھیں سینک رہے تھے۔

صُبحدم میں ابھی دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ "قسمت" کا گیت ع

"گھر گھر میں دیوالی ہے مرے گھر میں اندھیرا"

کی آواز سُنائی دی۔ کھلی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ موہنی مست ناگن کیطرح لہرا لہرا کر گا رہی تھی۔ کشوری پر اِک کیف سا طاری تھا۔ آخر اس نے اپنی آغوش میں لیکر لبوں پہ محبت کی مہر ثبت کر دی۔ لیکن اُس دن کے بعد وہ کچھ پژمردہ سا رہنے لگا۔ شاید اُسے موہنی کی پہاڑی ندی کی طرح چڑھتی جوانی اور اپنے اُترتے ہوئے شباب کا احساس ہو گیا تھا۔

ادھر نندو نے بھی حیلے بہانے کر کے کھڑکی کے سامنے سے گذرنا شروع

کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں جانب سے اشارے و کنائے شروع ہو گئے۔

ان ہی آثار و قرائن سے میں نے نیاز سے کہا تھا کہ اب پنچھی زیادہ دیر تک پنجرہ میں قید نہیں رہ سکتا۔

فراری سے ایک دن پیشتر موہنی ایک فلمی گانا گا رہی تھی تو میں نے نیاز سے کہا۔ اب قفس کی تیلیاں ٹوٹنا ہی چاہتی ہیں۔ وہ گانا یہ تھا۔

اِک تو ہو۔ اِک میں ہوں۔ اور ندی کا کنارا ہو

سماں پیارا پیارا ہو

دل کی بات لبوں پر آئی اور کہی نہ جائے۔

آنکھوں کا اسارا ہو اور کوئی نہ چارہ ہو

اس کے دوسرے دن پنچھی پنجرہ سے اڑ چکا تھا۔

رہ گذر یاد

کشور مرجھائے ہوئے پھول پتیوں پر اشکباری کر رہا تھا۔ نگاہیں اتنی محو کہ پتیوں میں گڑ کر رہ گئیں۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اس کی نگاہیں ان خشک پتیوں کو ہرا نہیں سکتیں

کہ میں یکایک کمرہ میں داخل ہو گیا۔

کشور میرے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ کچھ دن ہوئے وہ موسم گرما کی چھٹیاں گذار کر آیا تھا۔ آمد کے دن ہی سے اس کی طبیعت میں بڑی حد تک سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ سینما۔ کلب اور کرکٹ کے پروگرام خواب و خیال ہو چکے تھے۔

میرا خیال تھا کہ عرصہ طویل کے بعد اڑھائی تین ماہ بہن بھائیوں میں گذار کر آیا ہے اس لئے طبیعت اداس ہے۔ چند دنوں کے بعد کالج کے دلچسپ ہنگاموں میں دل بہل جائیگا۔ مگر یہ سب خیال غلط نکلے۔ اور جبکہ میں اس کے کمرہ میں ایک دم جا گھسا۔ اور اُسے اس طرح پھول پر اشکباری کرتے ہوئے

دیکھا تو حیران و ششدر سا رہ گیا۔ اُسے مطلق خبر نہ ہوئی کہ میں کتنی دیر سے اس کے کمرہ میں ہوں۔ میں نے اُسکے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

کشور! تم!

ہاں۔

تم رو کیوں رہے ہو؟

یوں ہی

آخر کوئی وجہ؟

جب رونا ہی ودیعت ہو چکا تو پھر دل کی ہوس کیوں رہ جائے۔

یہ پھول ادھر دو تو ——!

"نہیں! یہ برباد محبت کی نشانی ہے۔"

آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے۔ گہرا سانس لیکر وہ یوں گویا ہوا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ والد صاحب کا خط آیا تھا جس میں تعطیلات کے دنوں میں فوراً گھر چلے آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس کے بعد اُسنے تصورات میں کھو کر گذری ہوئی داستان کا نقشہ کھینچکر میرے سامنے رکھ دیا۔ اور سرزمین کشمیر کا ماحول میرے دل و دماغ میں مرتسم ہو گیا۔

دو طرفہ سفیدے کے درختوں میں ہوتی ہوئی سڑک بڑی بڑی پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹتی ہوئی ایک پہاڑ کے پیچھے گم ہو گئی تھی۔ یہیں سے ایک پگڈنڈی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی بستی تک پہنچتی تھی۔ نیچے بہت گہری گہری کھڈیں

تھیں جنھیں دیکھ کر دہشت سی طاری ہو جاتی تھی۔ کالے کالے بادلوں کے گالے دھوئیں کی طرح پہاڑوں کے بیچ سے سر اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ دھند و غبار سا بن کر انھیں میں سما جاتے۔ آسمانی فضا نہایت دلکش ہو گئی تھی۔ بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی سورج شرمیلی دلہن کی طرح جھانک لیتا تھا۔ ہری ہری دوب کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ جنگلی چڑیوں کے گیت اور کبھی کبھی کسی چھوٹے پرند کی سوز سے بھری ہوئی چیخ رونگٹے رونگٹے میں انبساط و سرور کی لہر پیدا کر دیتی۔

ڈھلانوں کے نیچے ترائی میں چھوٹے چھوٹے پتھر کے مکان گڑیوں کے گھر کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ چلتے چلتے وہ چشمہ کے کنارے پہنچا۔ یہاں گاؤں کا ایک ریوڑ چر رہا تھا۔ چشمہ میں کنول کے پھولوں کے درمیان ایک بیباک چرواہن نہا رہی تھی۔ گورا گورا گدرا جسم۔ گویا یونانی صناعی کا مرمریں مجسمہ۔ جب وہ پانی میں غوطہ لگا کر سینہ آب پر ابھرتی تو لمبے لمبے بالوں سے پانی کے قطرے شبنم کے قطروں کی طرح کنول کے پتوں پر سے کھسکتے ہوئے پانی میں جا ملتے۔ ہری ہری دوب اور جنگلی گلاب کی خوشبو اسکے دماغ کو معطر کئے جا رہی تھی اور وہ تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ ایکا ایکی گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے نوکر نے کہا۔

"بابو جی! اب بنگلہ قریب ہی ہے"

"آپ سامنے چشمہ پہ ہاتھ منہ صاف کر لیجئے۔ چہرہ کملا سا گیا ہے۔" یہ روکھے سے الفاظ اسکے تصورات میں خلل انداز ہو رہے تھے۔

وہ چشمہ کے قریب پہنچا۔ اسکے کھوئے ہوئے تصورات پھر سے مل گئے۔

چشمے میں چوڑے چوڑے اور بڑے بڑے پتوں کے بیچ ہزاروں کنول کھلے ہوئے تھے۔ شام کی شفق کا عکس پانی پر سونے کی تہہ معلوم دیتی تھی شگفتہ کنول سنہری مرغابیوں کی طرح ہلکی ہلکی ہوا کے بار سے سطح آب پر جھک رہے تھے۔ ان کے درمیان وہ بھی ایک کنول کے مانند تھی۔ بھیگے ہوئے بالوں پر سے سرکتے ہوئے پانی کے قطرے شام کی لالی میں رنگے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے بالوں میں ہیرے جواہرات جڑ دیئے ہیں۔ یا آکاش سے تارے توڑ کر اسکے بالوں میں اٹکا دیئے ہیں۔ اُسنے اپنی عُریاں بانہوں کو پانی پر پیرتے ہوئے اس کی طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی کشور بابو ہیں نا؟"

"ہاں۔ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔"

"مجھے۔ ہاں!"

"یاد کر لیجیئے۔ شاید اسی چشمے پر۔"

"کچھ یاد نہیں۔ مدت کی بات ہے۔"

"میں یاد کرائے دیتی ہوں۔ جب آپ اسکول سے بھاگ کر اسی چشمہ پر آکر پناہ لیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی میری بھیڑوں کو کھیتوں میں جانے سے روک دیا کرتے تھے۔"

"او۔۔۔ یاد آگیا۔۔۔ تم رجنی ہو! اب تو تم بہت بڑی ہو گئی ہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

"میں تو نہیں بھولی بابو — سچ ہے۔ امیر لوگ بھول جانے کے عادی ہیں"

"نہیں — ایسا نہ کہو۔"

اور اس کے دماغ میں گذرے بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔

جاؤ۔ ہم نہیں بولیں گے تم سے۔ تم روز "راجہ رانی" کا کھیل کھیلنے کو کہتے ہو۔ مگر کھیلتے بھی ہو؟

راجہ کون بنے گا — "تم" اور "رانی" "ہم"۔

دیکھو۔ یہ ہمارا محل ہے چشمے کی گیلی مٹی اور ریت سے بنا ہوا

"اب تو بہت پڑھ گئے ہو گے بابو۔ بہت بڑی نوکری ملے گی۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے سال خوردہ پتھر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ جس پر بڑے بڑے دھندلے حروف میں اب بھی "رجنی رانی" کھدا ہوا تھا۔

"بابو — تم اداس ہو گئے ہو۔ وہ بچپن تھا۔ اور اب زندگی کی دوسری منزل ہے۔ بچپن اور اس کی باتیں گئی گذری ہو چکیں

تم یہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ نہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ کہ سالوں کے بچھڑے پھر سے مل گئے ہیں۔

میں خوش ہوں۔ اسی دن سے جس دن ننھے منّو نے بچوں میں کھیلتے کھیلتے تمہارے آنیکا ذکر کیا۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور اس دن تک تمہاری منتظر رہی۔ ہفتہ بھر سے بھیڑوں کو چشمے کے دوسرے کنارے بھی نہیں لیکر گئی۔

تم آگئے ۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی ۔

"کشور بابو — کشور بابو" نوکر نے چلاتے ہوئے کہا " جلدی کیجیے"

اُس نے جلدی جلدی تولیہ سے مُنہ صاف کرتے ہوئے ——— رجنی سے کہا ۔

سُنو تو — رجنی نے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے باہر قدم رکھا ۔ گیلے بالوں کو اس ادا سے جھٹکا دیا کہ ہزاروں ناگنوں کا زہر کشور کی رگ رگ میں سما گیا ۔ اُس کے چُست گیلے لباس میں جسم کا تمام اتار چڑھاؤ صاف دکھائی دیتا تھا ۔ وہ اسکے نزدیک تن کر کھڑی ہوگئی ۔ جیسے فردوس بریں کی کوئی حُور جوانی کی آب حیات میں نہا کر آئی ہو ۔

اُس کی نس نس میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ۔ جیسے ہزاروں شراب کے جام اسپر انڈھیل دیئے گئے ہوں ۔ نزدیک ہی جنگلی گلاب کھلا ہوا تھا ۔ نازک و نرم ہاتھ اسکی طرف لپکے ۔ اور دوسرے لمحے گلاب کا ننھا سا پھول پتلی پتلی لمبی لمبی انگلیوں کے درمیان تھا ۔

آہستہ سے اُسنے کشور کے کوٹ کی کالر میں اٹکاتے ہوئے کہا ۔

" پھر نہ جانے کب ملاقات ہوگی ۔ کل تو میکے چلی جاؤں گی ! "

کشور کا تمام نشہ اُتر گیا جیسے کسی نے شرابی کو ترشی کا جام دیدیا ہو ۔

" تمہاری شادی ہوگئی ! "

" جی ! "

دوسری طرف نوکر کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

وہ جھاڑیوں اور ڈھلانوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا۔ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چھوٹے سے میدان میں پہنچا۔ سامنے ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔

دُور سے چھوٹے بہن بھائیوں نے زور زور سے چلاّنا شروع کر دیا شوشی۔ شوشی بہن۔ بھیاّ آ گئے۔ بھیاّ آ گئے۔ وہ تالیاں بجاتے بنگلے کی طرف بھاگ گئ۔

جہاں اُن کی شوشی بہن کھڑی اِدھر ہی دیکھ رہی تھی۔

"مُنو! یہ شوشی بہن کون ہے؟"

اُس نے ننھے کو گود میں آہستہ سے لیتے ہوئے کہا۔

"خالہ کی لڑکی — شوشی بہن!"

"کون خالہ"— "ماں جی کی بہن ہے نا — ہماری خالہ — شوشی کی ماں جی!"

وہ سوچنے لگا۔ ماتا جی کی تو بہن نہیں۔ تمام عُمر انھیں یہی صدمہ رہا کہ اُن کی کوئی بہن نہ ہوئی۔ کوئی سہیلی ہو گی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گھر میں داخل ہوا۔

ابھی سامان وغیرہ کمرہ میں دُرست کر کے رکھ ہی رہا تھا کہ ننھے مُنو نے نے آکر شور مچانا شروع کر دیا۔

"بھیا! کیا میرے لئے ریل گاڑی۔ موٹر۔ اور مُنی کے لئے گڑیا لائے ہو۔"

"ہاں! لایا ہوں —"

ابھی بکس میں بند ہے۔

"مگر آپ میرے لئے بھی کچھ لائے ہیں؟" یہ شوشی کی آواز تھی۔ وہ چونک اُٹھا۔

"آپ کے لئے"۔۔۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا جواب دے۔

"تمہارے لئے بھی اک حقیر سا تحفہ میرے پاس ہے۔ مگر آپ کو اس کے لینے کی کیا جلدی ہے۔۔۔"

"دیکھیں تو۔ وہ کون سا تحفہ ہے؟" شوشی نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

وہ کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ کالر سے پھول نکل کر اُس کے پاؤں میں آن گرا۔

کشور چِلّا اُٹھا۔ دیکھئے آپ نے ....

شوشی نے معصوم نگاہوں سے معافی طلب کرتے ہوئے پھول اُٹھا کر اپنی شانوں سے امر بیل کی طرح لٹکتی ہوئی چوٹی میں اٹکا لیا۔

کتنا اچھا پھول ہے"۔کیا میں لے سکتی ہوں کشور بابو؟"

اس کی زبان اندر ہی اندر رہی۔ مگر مُنہ سے بات نہ نکل سکی۔ جیسے کسی نے ٹانکے لگا دیئے ہوں۔

وہ ناچتی ہوئی شرارتی آنکھوں سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی۔ کشور کو اسکی اداؤں اور جوانی کی رعنائیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ متواتر سینے پر جھومتی ہوئی

چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔

چند ہی دِنوں کے بعد اُسکی شادی شوشی سے طے پا گئی۔

شوشی کی خوشیاں جگمگا اُٹھیں۔ وہ تمام دن بچوں کی بلائیں لیتی پھرتی۔ کبھی منو کا منہ چومتی کبھی شوخ انگلیوں سے اُسے رُلاتی۔ رات کو میٹھی میٹھی لوریاں سنا کر سُلا دیتی۔

یہ دھیمے دھیمے سُر کبھی کبھی بلند فضا میں پرواز کرتے ہوئے دُور نکل جاتے۔ کشور اپنے کمرہ کے کواڑ بند کر لیتا اور لحاف میں مُنہ چھپا لیتا۔ وہ اِس شادی پر بالکل رضامند نہ تھا۔

وہ کب تک خاموش رہتا۔ آخر اس نے اپنی ہمت کو بڑھاتے ہوئے ایک دن اپنی ماں کو کہدیا کہ اُسے یہ شادی منظور نہیں۔

ماں باپ کی ضد ——— اور التجاؤں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ مگر ——— اُسنے واپس کالج لوٹ آنیکا ارادہ کر لیا۔

رات بھر وہ ضروری کپڑے سمیٹتا رہا۔ اور علی الصبح اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ دروازے پر شوشی کھڑی تھی۔

"تم! اس وقت یہاں۔"

"جی!"

آپ جا رہے ہیں؟

اُسنے کتاب سے مرجھایا ہوا گلاب نکالتے ہوئے کہا" یہ میری یاد ہے۔ آپ بیتے جائیے۔ نمستے"۔

اُس کی آواز بھرّا گئی۔ آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ وہ ساڑھی کے آنچل سے مُنہ چھپاکر سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے کمرہ میں واپس چلی گئی۔

کشور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ باہر بُڈھا نوکر اسکا ایسے منتظر تھا۔ جیسے اُسے پہلے ہی اطلاع ہو چکی ہو۔

نوکرا ٹیچی کیس اُٹھائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا کشور نہ جانے پتھریلی زمین پر نظریں گاڑے کیا سوچتا جا رہا تھا۔ صُبح ہوئی۔ افق میں کہیں کہیں شفق کی لرزتی ہوئی لالی کا عکس خون کا بہتا دھارا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قطرے ہرے ہرے درختوں کے پتّوں سے آنسوؤں کی طرح زمین پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

کھلے ہوئے لال جنگلی پھولوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

"کون ہے؟" پیچھے آتے ہوئے بدلو نے کہا۔

"او ــــ بیٹی رجنی تم ــــ تم آگئی ہو۔

کشور کے دل کو دھکّا سا لگا۔ اُس نے ایکبار بھی گردن پھیر کر پیچھے نہ دیکھا۔ آخر رجنی نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جا رہے ہیں کشور بابو!

"تمہیں کس نے بُلایا تھا اسوقت۔ کیا زخموں پر نمک چھڑکنے آئی ہو۔ اُس نے

گہری سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

آنکھیں بھر آئیں وہ سوچنے لگا کہ یہ سب کھیل ہے جو سینما کی تصویروں کی طرح ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گذر رہا ہے جس سے اس کی زندگی کے بہاؤ میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی جیسے کوئی ندی پر بند باندھ دے۔

شام کی سرخی گہری ہو کر دھیرے دھیرے غائب ہو رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر تھے مگر وہ متواتر رو رہا تھا۔ آنسو پھول کی خشک پتیوں پر گر رہے تھے جیسے اوس کے قطرے۔

شائد وہ اپنے آنسوؤں سے مرجھائے ہوئے پھول کو زندگی اور تازگی بخشنا چاہتا تھا۔

اسکو معلوم ہی نہ تھا۔ جیسے بیتے ہوئے لمحے واپس نہیں آتے ایسے ہی خشک پتیاں زندگی اور تازگی حاصل کرنیسے یکسر قاصر ہیں۔ ایک دن نہیں کئی سال تک بھی سیلاب اشک انھیں تر و تازہ کرنے سے عاجز ہیں۔

("سیب کا درخت" اور کرشن چندر کے ناول سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔)

تمام شد

